اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۰۸ء)

اِقبال رِیویو

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۰۸ء)

اقبال ریویو

جلد (۱۷) شمارہ (۱)

ISBN No: 81-86370-36-6

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین۔ایڈیٹر
(معتمد اکیڈیمی وایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۵۰ روپئے

ایک سال (دو شمارے) ۹۰ روپئے

بیرونی ملک فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔حیدرآباد۔500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون: 66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، افضال الحق ندوی ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO.16-8-907/A،
نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024۔فون: 9392427796

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے وی جی پرنٹرز لسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱۔ اداریہ	سید امتیاز الدین	۴
۲۔ جاوید نامہ، اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	پروفیسر شمیم حنفی	۵
۳۔ اقبال ایشیائی بیداری کا شاعر	پروفیسر عبدالحق	۵۴
۴۔ اقبال شناس مردِ بیابانی۔ سید احمد ایثار	پروفیسر عقیل ہاشمی	۷۵
۵۔ اقبال اور مجلّہ عثمانیہ	طارق محمود	۸۴
۶۔ خبرنامہ	ادارہ	۹۱

○○○○

اداریہ

علامہ اقبال کی وفات کوستر 70 برس بیت چکے ہیں۔آج بھی ان کے افکارواشعار ہماری فکر کے لیے نئی راہوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے اقبال آج بھی ہمارے ساتھ ہیں اورہمیں عصر حاضر کے مسایل کی طرف توجہ دلارہے ہیں ۔کوئی سال ایسانہیں گزرتا جب کسی نہ کسی اہل نظر کی کتاب منظرعام پرنہیں آتی جس میں کلام اقبال پر نئے زاویے سے نظرنہ ڈالی گئی ہو۔

اقبال ریویو کے تازہ شمارے میں دونہایت فکرانگیز مضامین شامل ہیں جن کومطالعۂ اقبالیات میں اہم جگہ ملنی چاہے، پروفیسر شمیم حنفی کا مضمون ''جاوید نامہ،اقبال اورعصر حاضر کا خرابہ''اس شمارے کا نہایت اہم مضمون ہے ،پروفیسر شمیم حنفی پچھلے دنوں اقبال اکیڈیمی تشریف لائے تھے۔انھوں نے یہ مقالہ اقبال اکیڈیمی کی خصوصی محفل میں پڑھا تھا جوان کے اعزاز میں منعقد ہوی تھی ۔ پروفیسر شمیم حنفی نے بتایا کہ اس فکرانگیز مقالے کا محرک پروفیسر سید سراج الدین مرحوم کا جاوید نامہ کا وہ ترجمہ ہے جس کی رسم اجران ہی کے ہاتھوں پچھلے سال انجام پائی تھی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اقبال کے جاوید نامے اورایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کوبیسویں صدی کے دواہم ترین شعری کارناموں میں شمارکیا ہے جہاں ایلیٹ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا صدمہ اٹھاے ہوئے ہے اور انسانیت کے مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے، وہیں اقبال اپنی کشتِ ویراں سے مایوس نہیں اورایک بہتر مستقبل کے آرزومند ہیں۔

حسن اتفاق سے پروفیسر عبدالحق سابق صدرشعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی بھی کچھ عرصہ قبل اقبال اکیڈیمی تشریف لائے تھے۔انھوں نے اقبال اکیڈیمی میں ایک توسیعی لکچر بعنوان ''اقبال ایشیائی بیداری کا شاعر''دیا تھا۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کے فارسی اوراردوکلام کی روشنی میں ثابت کیا کہ اقبال کی دوربین نگاہ ایشیا کی اہمیت کو برسوں پہلے سمجھ گئی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایشیا ساری دنیا کے لیے نقیب آزادی ثابت ہوگا چین جسے اقوام مغرب خوابیدہ سمجھ رہی تھیں اُس کی بیداری کی نمود بھی اقبال نے سنائی تھی۔ہمیں خوشی ہے کہ عبدالحق صاحب نے یہ مضمون بغرض اشاعت ہمیں عنایت فرمایا۔ڈاکٹرعقیل ہاشمی سابق صدرشعبۂ اردوعثمانیہ یونیورسٹی نے ہماری درخواست پرمترجم کلام اقبال سید احمد ایثار پرایک مضمون ہمیں عنایت فرمایا جواس شمارے میں شامل ہے۔''اقبال اورمجلّہ عثمانیہ'' جناب طارق محمود استاد شعبۂ اردو خانیوال پی جی کالج کا ایک تحقیقی مضمون ہے ۔ہمیں اسے شامل کرتے ہوئے بڑی مسرت ہورہی ہے۔ہمیں امید ہے کہ اس شمارے کی نگارشات اقبال شناسوں کی دل چسپی کا باعث ہوں گی۔

سید امتیاز الدین

پروفیسر شمیم حنفی
سابق صدر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

جاوید نامہ، اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ

(ایں کتاب از آسمانے دیگر است)

(زیر نظر مقالہ اقبال اکیڈیمی کے اجتماع منعقدہ ۱۸ر فروری ۲۰۰۸ء میں پڑھا گیا)

o

تنہائی اور ناصبوری..... تخلیقی توانائی کے انہی دو سرچشموں سے جاوید نامہ کا ظہور ہوا ہے۔ یہ سرچشمے اقبال کے منفرد شعور کا شناس نامہ بھی کہے جا سکتے ہیں۔ اقبال کا شعر ہے:

چہ کنم کہ فطرت ما بہ مقام در نہ سازو
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

اس ناصبوری نے تا عمر اقبال کے شعور کو حرکت پذیر اور متجسس رکھا۔ چنانچہ تنہائی اور ناصبوری کی طرح، سفر بھی اقبال کے تفکر کا ایک مستقل اور مرکزی نشان ہے۔ یہ رویّہ اقبال کی اپنی طبیعت کے علاوہ اقبال کے عہد کی سرشت سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ بیسویں صدی انسانی تاریخ کے پس منظر میں اپنی کئی خاصیتوں کی بنیاد پر الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ بہت سی اور باتوں کے علاوہ، یہ بات بھی اس صدی کو دوسری صدیوں سے ممیّز کرتی ہے کہ وقت اور واقعات کی رفتار بیسویں صدی کے دوران بہت تیز ہوگئی تھی۔ تیز روی میں جو ایک خلقی تشدد کا عنصر پایا جاتا ہے، اس کے مظاہر اس پوری صدی کی بساط پر پھیلے ہوئے ہیں۔ دو عالمی جنگوں سے قطع نظر، اس دور کے سماجی مفکروں کا یہ قیاس بھی ایک خاص معنویت رکھتا ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے پچیس برسوں کے دوران دنیا جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئی، سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا میں جو انقلابات آئے، جو ذہنی اور اخلاقی ماحول قائم ہوا، جس طرح کے واقعات رونما ہوئے، اتنی انہونی، غیر معمولی اور نا قابل یقین باتیں پچھلی کئی صدیوں کے دوران رونما نہیں ہوئی تھیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد کا دور اپنی بوالعجبی کے ساتھ ساتھ ایک عظیم اضمحلال کا دور بھی تھا۔ یہ اضمحلال صدیوں کی

آزمودہ قدروں کی شکست کے احساس اور عام انسانی صورت حال کے تئیں ایک گہری بے یقینی کا رائیدہ تھا۔ اسی بے کراں اداسی کی تہہ سے ادب کی دنیا کے دو سب سے بڑے واقعے بھی نمودار ہوئے۔ ان میں ایک تو ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ (The Wasteland) کی اشاعت (۱۹۲۲ء) ہے۔ دوسری جیمز جوائس کے ناول یولیسس (Ulyses) کی اشاعت (۱۹۲۲ء)۔ یہ دونوں کتابیں ادب کی روایت میں دو تخلیقی معجزوں کے بجائے دراصل دو انقلاب آفریں تجربوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے واسطے سے ادب کی دنیا میں ایک نئی حسیّت کی شروعات ہوئی۔

اقبال نے ان دو تجربوں کو کس سطح پر اور کیونکر قبول کیا تھا، قبول کیا بھی تھا یا نہیں؟ اس کی کوئی شہادت ہمیں اقبال کے سوانح میں نہیں ملتی۔ اقبال کی ذہنی زندگی کا افسانہ ان کے براہ راست تذکرے سے خالی ہے۔ لیکن یہ دونوں تجربے جس ذہنی اور جذباتی صورت حال اور جس تخلیقی واردات کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کا سایہ اقبال کے شعور کی سطح پر صاف دیکھا جا سکتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ایلیٹ کے برعکس اقبال اپنے عہد کی ''کشتِ ویراں'' (ویسٹ لینڈ یا خرابے) کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے۔ اسی طرح جیمز جوائس کے برعکس، اقبال گرد و پیش کی دنیا کے مظاہر اور اشیا میں ابتری اور باہمی بے تعلقی کے باوجود ایک تنظیم کے خواب سے بھی دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ ان کی نظر انسانی صورت حال کی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس کے امکان پر بھی تھی۔ وہ ایک مستحکم اور پائیدار فیوچرسٹ (Futurist) رویّہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آداں گارد میلانات جو اقبال کی معاصر دنیا میں رونما ہوئے ان میں مستقبل بینی یا فیوچرزم کے عنصر کا جیسا پختہ، رچا ہوا اور انسان دوستانہ ادراک اقبال کے یہاں ملتا ہے، ان کے زمانے کسی بھی مشرقی یا مغربی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اقبال کی شاعری میں تاریخ کا حوالہ ان کے تمام مقامی اور بیرونی شاعروں کی بہ نسبت زیادہ منظم اور نمایاں ہے۔ بیسویں صدی کی انسانی صورت حال کو تاریخ نے جو پس منظر مہیا کیا تھا، گذشتہ صدیوں کے دوران جو بڑے واقعات رونما ہوئے تھے، انسانی فکر اور عمل کی دنیا میں جو تبدیلیاں در آئی تھیں اور زندگی کی بابت سوچنے اور زندگی کو برتنے کے آداب و انداز پر جن باتوں کا اثر پڑا تھا، ان سب کا مجموعی ادراک اقبال کی شاعری میں بہت واضح ہے۔

☆

اردو کی شعری روایت میں اقبال سے پہلے تاریخ کو اپنے تخلیقی تفکر کا حوالہ بنانے کی صرف دو بڑی اور اہم مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہاں میرا اشارہ حالی اور اکبر کی طرف ہے۔ حالی نے ''مسدّس مدّ و جزر اسلام'' کی تخلیق اسی حوالے کے سیاق میں کی تھی۔ ان کا موضوع قوموں کے عروج و زوال کی عام داستاں کے بجائے دراصل مسلمانوں کے عرج و زوال کی روداد تھی۔ اسی طرح اکبر کی پوری شاعری بھی مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم سے زیادہ، مذہب اور سائنس کی کشمکش یا مسلمانوں کے فکری انحطاط اور انگریزی اقتدار کے عروج میں مضمر، زوال کا احاطہ کرتی ہے۔ شاعر سے زیادہ یہ دونوں اپنے اپنے دور کے سماجی مبصر دکھائی دیتے ہیں۔ مصلحانہ جوش دونوں کے یہاں نمایاں ہے، اس حد تک کہ ان کی شاعری کے بیشتر حصّے میں قومی اصلاح کا جذبہ تخلیقی تجربے پر حاوی نظر آتا ہے۔ حالی اور اکبر، دونوں کی شاعری کا عام مزاج اجتماعی تاریخ کے عمل اور بدلتے ہوئے تہذیبی مزاج پر ایک غم آلود تبصرے کا ہے۔ اس کے برخلاف جاوید نامہ میں اقبال نے نہ تو دانتے اور ملٹن (ڈوائن کامیڈی اور پیراڈائز لاسٹ) کی طرح کا مذہبی موقف اختیار کیا ہے، نہ اپنے آپ کو ایلیٹ کی طرح (ویسٹ لینڈ) صرف اپنے گردوپیش کی دنیا کے اجڑ جانے اور جدید انسان کی ہزیمت زدگی کے بیان تک محدود رکھا ہے۔ بیسویں صدی کا معاشرتی، فکری اور جذباتی ماحول، بلاشبہ انیسویں صدی کے اس ماحول سے کہیں زیادہ پُر پیچ اور کثیر الجہات تھا جس میں حالی اور اکبر کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ اسی لیے اس واقعے کے باوجود کہ تاریخ کو اپنا بنیادی حوالہ بنانے کی روش حالی، اکبر اور اقبال کے یہاں مشترک ہے، اقبال کا شعور، حالی اور اکبر کی بہ نسبت بہت پیچیدہ ہے اور ایک ساتھ افکار، احساسات کی متعدد سطحیں رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ تاریخی واقعات اور احوال پر اپنے براہ راست تبصروں کے دوران بھی، اقبال ہمیں حالی اور اکبر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں کہ نسبتاً ایک زیادہ الجھی ہوئی دنیا اقبال کے تجربے میں آئی تھی یا یہ کہ اقبال نے مشرق و مغرب کے مسئلوں کو زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھا تھا۔ اقبال کے ذہن اور شخصیت کی تعمیر جن عناصر کی مدد سے ہوئی تھی، وہ بہت مختلف تھے۔ جاوید نامہ کی تشکیل میں یہ تمام عناصر ایک ساتھ سرگرم رہے۔ لہٰذا اس حقیقت سے قطع نظر کہ زندگی ہمیشہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف بڑھتی ہے، اقبال کا اپنا شعور بھی، بعض مختلف اور متضاد عوامل کے باعث کم پیچیدہ نہیں تھا۔ ان کی ذہنی زندگی کے ابتدائی اور تشکیلی

دور میں مشرق و مغرب کی تقریباً تمام اہم روایتیں ان پر ایک ساتھ اثر انداز ہوئی تھیں۔ ہندستان میں یہ دور ایک نئے قومی شعور کے فروغ کا تھا جب بتدریج برطانوی اقتدار کی نوآبادیاتی قدروں سے بیزاری، ایک اجتماعی جدوجہد کی راہ ہموار کرتی جارہی تھی اور انگریزی حکومت سے آزادی کی طلب نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مغرب میں جہاں اقبال کے شعری مزاج کو باقاعدہ طور پر اپنی تنظیم و اظہار کا خیال آیا، معاشرتی سطح پر ایک گہری ابتری کے آثار نمایاں ہو چلے تھے اور جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی کامرانی میں یقین رفتہ رفتہ کمزور پڑتا جارہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک طرف روس میں سماجی انقلاب کا تصور تیزی سے پھیل رہا تھا اور دوسری طرف اقبال کے باطن میں ایک ایسے معاشرے کا خواب جنم لے رہا تھا جس کی تعمیر سماجی انصاف، معاشی عدم استحصال اور انسان دوستانہ قدروں کی بنیاد پر کی گئی ہو۔ بال جبریل کی چھوٹی سی نظم جس میں اقبال نے لندن میں جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر جواباً جاوید سے خطاب کیا ہے اور جسے ان کی تخلیقی زندگی کے شاہکار جاوید نامہ اور ان کی عمر بھر کے تجربوں کی اولین اساس کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، اقبال کے شخصی طرز احساس اور ان کے معاشرتی سروکار، دونوں سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ اس نظم کے یہ شعر ہمیں بار بار جاوید نامہ کے اختتامیے کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس میں اقبال نے جاوید کے واسطے سے نئی نسل کو خطاب کیا ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

یہ اشعار صرف ایک شخصی اور انفرادی منشور کی نشاندہی نہیں کرتے..... ان سے ایک اجتماعی نصب العین، ایک سماجی آدرش اور ایک قومی دستور العمل کی تصویر بھی مرتب ہوتی ہے اور یہی مخصوص اور منفرد انداز نظر اقبال کو ان کے معاصر ترقی پسندوں کے طرز فکر سے ممیز بھی کرتا ہے۔ سماجی انصاف اور عالمی برادری یا بھائی چارے کی قدروں میں اپنے غیر متزلزل یقین کے باوجود، اقبال کی فکر جو عام اشتراکی فکر کے سانچے میں جذب ہونے سے انکار کرتی ہے، تو اسی لیے کہ اقبال کے شعور میں انفرادی انا کا احساس اجتماعی انا کے تصور سے ہمیشہ برسر پیکار رہتا ہے۔ انسانی معاشرے کے فلاحی تصور کو اقبال کبھی بھی صرف ''شکم کی مساوات'' کے تصور تک محدود نہیں سمجھتے۔ اقبال کی فکر کا سفر ذات سے شروع ہوتا ہے اور ذات پر ہی ختم ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ چاہے اپنے آپ سے مکالمہ قائم کر رہے ہوں، یا اپنی دنیا سے، یا خدا سے، اپنے انفرادی نفس کا احساس انہیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ اپنے آپ سے دست بردار ہونے پر کبھی بھی آمادہ نہیں ہوتے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

سے لے کر ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

تک، اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں اسی خیال کے رنگ پھیلے ہوئے ہیں اور اسی ایک روداد کو بیان کرنے سے اقبال کبھی بھی تھکتے نہیں ہیں۔

☆

مارکسزم کے ساتھ ساتھ اقبال کے عہد کا دوسرا بڑا فکری اسلوب وجودیت Existentialism کے فلسفے کا پروردہ ہے۔ اردو کی شعری روایت میں اقبال وجودی فکر کے سب سے بڑے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ اگر کوئی اور نام لیا جا سکتا ہے تو غالب کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کی وجودی فکر اردو اور فارسی شعرا کی متصوفانہ فکر سے یکسر مختلف تھی اور تصوف کی عام روایت کا اقبال کی شاعری پر کوئی اثر نہیں ملتا۔ البتہ غالب کو اقبال نے تخلیقی تفکر کے ایک معیار کے علاوہ ایک شخصی آدرش کے طور پر بھی دیکھا تھا۔ بانگ درا کی ایک نظم میں انہوں نے غالب کو اس

طرح خراج تحسین پیش کیا تھا کہ

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

جاوید نامہ میں اقبال نے، غالب کو فلک مشتری پر منصور حلاّج اور قرۃ العین طاہرہ کی روحوں کے ساتھ دریافت کیا ہے۔ ان تینوں نے بہشت میں سکون اور طمانیت سے معمور قیام پر، ایک اضطراب آسا گردش جاوداں کو ترجیح دی تھی۔ ان کی فکر کے زاویے الگ الگ ہیں لیکن ایک وصف جوان میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے اپنے دور کے عام چلن سے دوری اور ایک خلقی ناصبوری کا ہے۔ یہ قیام کے بجائے سفر کے نمایندے ہیں۔ ایک اندرونی پیچ وتاب انہیں کسی پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور اپنے سوالوں کے نرغے میں گھرے ہوئے، یہ تینوں اپنے آپ کو اپنے اضطراب اور افسردگی میں دریافت کرتے ہیں۔

غالب سے اقبال کی مناسبت بھی باطنی پیچ وتاب کی اسی سطح پر قائم ہوتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اقبال بالآخر شعور کے ایک مرکز تک رسائی میں کامیاب ہوئے اور ایک گہرے روحانی یقین کو انہوں نے اپنی تگ ودو کا حاصل سمجھ لیا، جب کہ غالب تاعمر اپنے سوالوں میں الجھے رہے، لیکن اس فرق کے باوجود غالب کی فکر کا یک پہلو جو اقبال کی فکر سے ہم آہنگی کی شہادت دیتا ہے، وجودی مسئلوں سے ان کا شغف ہے، دونوں کا بنیادی سروکار اپنے وجود کی غایت اور زمان و مکاں کی کائنات میں اپنی موجودگی اور اپنے اختیارات کے جواز سے ہے۔

بیسویں صدی کے دوران وجودیت کے فلسفے کو، اس پریشاں ساماں عہد کے مرکزی اور نمایندہ مکتب فکر کے طور پر جو دیکھ گیا، تو اسی لیے کہ وجودیت انسان کی ہستی کو اس کے ہر امکان سے پہلے دیکھتی ہے اور اس کی صورت حال کے پس منظر میں اس کے روحانی مسئلوں کو سمجھنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بھی غور طلب ہے کہ اقبال نے مذہبی وجودیت کے کسی

ترجمان مثلاً کر کے گار مارسل یا بوبر کے بجائے ایک طرح کی انسان دوستانہ وجودیت (Humanistic Existentialism) سے سروکار رکھا۔ یہ زاویۂ نظر اقبال کی فکر کے وجودی عناصر کو سماجی یا مارکسی وجودیت کے عناصر سے قریب لاتا ہے اور دونوں میں مطابقت کی تلاش کرتا ہے، لیکن صرف ایک محدود سطح پر۔

متصوفانہ شعری کی روایت میں وجودی تجربے یا وجودی فکر کے جو عناصر ملتے ہیں، ان کی نوعیت نطشہ سے مارلیو پونتی تک کی وجودیت کے مزاج سے بہر حال مختلف ہے۔ اقبال کی وجودی فکر نے بالواسطہ طور پر وحدت الوجود کے تصور اور نطشہ کی فکر سے جو بھی اثر قبول کیا ہو، لیکن تاریخیت کے تصور کی ایک ذاتی تعبیر کی طرح اقبال نے وجودی فکر کو بھی اپنے مجموعی وژن کے مطابق ایک نئی جہت دی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا شعور سب سے زیادہ ہم آہنگ رومی سے ہے جنہیں جاوید نامہ میں اقبال کے قائد اور رہ نما کی حیثیت حاصل ہے۔

☆

لیکن اقبال اور رومی کی ذہنی موانست پر نظر ڈالنے سے پہلے، جاوید نامہ کی ہیئت ترکیبی اور اسٹرکچر کے سلسلے میں بعض نکات کی نشاندہی ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، جاوید نامہ سے پہلے جدید دنیا کے مسئلوں کے ہمہ گیر احاطے کی سب سے معروف کوشش ہمیں ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ میں ملتی ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ ایلیٹ نے اپنی نظم پہلی عالمی جنگ کے آثار اور اثرات سے واضح طور پر متاثر بلکہ مغلوب نظر آنے والے اس ماحول میں کہی تھی جو ایک گہری ہزیمت زدگی، مایوسی اور افسردگی کی گرفت میں تھا۔ جنگ کی ہیبت نے مغربی حسیّت کو لاحاصلی، بے سمتی اور مایوسی کے جس میلان سے ہم کنار کیا تھا اس نے مغرب کی سرزمین پر رونما ہونیوالے ادب، آرٹ اور ثقافت کے محور بدل کر رکھ دیے تھے۔ اقدار کی شکست و ریخت، تشدد کی ایک ہولناک لہر نے صدیوں کی پالی پوسی روایتوں اور ایقانات کی بنیادیں کمزور کر دی تھیں۔ اس صورت حال میں جو عام اضمحلال بتدریج پھیل رہا تھا اور انسانی رشتوں پر جو ضرب پڑ رہی تھی، اس کے باعث انسانی مستقبل کے بارے میں یا کسی اجتماعی امکان کے بارے میں امید یا اعتماد کے ساتھ سوچنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ نامرادی کے دھوئیں کی ایک چادر تھی جو چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اخراج بشریت (Dehumanization)، ریزہ کاری (Fragmentation) اور

انحطاط پسندی (Decadence) کا جو میلان ویسٹ لینڈ کی اشاعت کے بعد تیزی سے عام ہوتا گیا، اس کا نقطۂ عروج بھوکی پیڑھی (Hungry generation) کی نمایندہ وہ تخلیقی دستاویز ہے جو ہمارے زمانے میں ایلن گینس برگ کی How I کے طور پر سامنے آئی اور جس میں مغرب کو مشرق کی راہ اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ (America ! When will you send your eggs to India) مشرق کی مابعد الطبیعات میں مغرب کے مادّی مسئلوں سے نجات کی تلاش کے مشورے دیے گئے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد کا مغربی ادب اور مغربی فلسفہ بالعموم انتشار اور افسردگی کے میلانات سے بوجھل دکھائی دیتا ہے۔ مارکسی فکر اور آواں گارد تصورات نے اس صورت حال کو یکسر بگڑنے سے ایک حد تک بچائے رکھا۔ لیکن مستقبل بینی (Futurism) اور امید پروری کے میلانات کے بہ نسبت مغرب کی تخلیقی ثقافت پر بیچارگی اور شکست کا احساس بہر حال حاوی دکھائی دیتا ہے۔

ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ اپنی ترکیب اور داخلی ہیئت کے لحاظ سے ایک طرح کا تخلیقی بیانیہ یا ڈیسرٹیشن (dissertation) تھی۔ اس نظم کے اثرات کم و بیش تمام مشرقی اور مغربی زبانوں کے ادب پر مرتسم ہوئے۔ جاوید نامہ بھی ایک مسلسل اور منظم تخلیقی بیانیہ ہے۔ لیکن اس کے لیے اقبال نے مثنوی کا فارم اختیار کیا۔ انیسویں صدی میں نظم جدید کی تحریک کے ساتھ مولانا محمد حسین آزاد اور حالی نے شعر کی دوسری ہستیوں پر مثنویہ کی ہیئت کو ترجیح جو دی تھی تو اسی لیے کہ یہ فارم اپنی بات کو تسلسل اور تنظیم کے ساتھ سامنے لانے کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی سے جاوید نامہ تک، مثنوی کے فارم یا اس کی ایک خاص ہیئت اور اسٹرکچر کو، اپنے معروضات کی تخلیقی پیش کش کے لیے اقبال نے مسدس کی اُس ہیئت سے زیادہ کارآمد اور مفید خیال کیا جس میں حالی نے ''مد و جزرِ اسلام'' کی روداد بیان کی تھی۔ مثنوی مولانا روم جاوید نامہ کے لیے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتی تھی۔ رومی نے جس بحر کا انتخاب کیا تھا وہ خیال کے بہاؤ اور واقعات کے مسلسل بیان، دونوں کے لیے موزوں ترین بحر تھی۔ اقبال نے کہیں خیال کو اس کی تجریدی شکل میں پیش کیا ہے، کہیں خیال کو مشخص اور مجسم طور پر ایک طبیعی مظہر کی شکل میں۔ دونوں صورتوں میں ان کے بیان کا تسلسل، وفور اور جوش قائم رہتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جاوید نامہ اپنے فکری مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے مثنوی مولانا روم کا ایک توسیعی

روپ بھی ہے۔ وہی پرسوز، دعائیہ آہنگ جس پر ایک نوائے سروش کا گمان ہوتا ہے۔ وہی جذباتی تموّج اور خروش جس سے شاعر کے باطن کی دنیا کے پیچ وتاب کی نشاندہی ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں وہی دھیما دھیما سا غنائی اور غم آلود لہجہ جو تفکر آمیز حسیّت اور درد رسیدہ احساسات کے اظہار کا حق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثنوی مولانا روم کی طرح جاوید نامہ میں بھی سرخوشی اور ہیجان کی کیفیت پر رفعت وجلال اور افسردگی کی ایک فضا حاوی دکھائی دیتی ہے اور ایسا اس واقعے کے باوجود ہے کہ اقبال کا ادراک اس نظم میں کسی واضح نشاطیہ یا المیہ عنصر کے بغیر ایک انتہائی متین، متناسب، گہرے تصورات سے معمور اور شروع سے اخیر تک ایک انتہائی ہموار سطح پر سامنے آیا ہے۔ جاوید نامہ میں بیان کی اسی روانی اور فطری تسلسل کا احساس ہوتا ہے جو اقبال کے ساقی نامہ میں ہے۔

☆

بیسویں صدی کے سماجی مفکروں نے اس عہد کو جہاں اور بہت سے نام دیے ہیں وہیں اسے ''پریشاں خیالی کے ایک عہد'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ کہ جاوید نامہ کو جس انسانی صورت حال نے ایک خاص پس منظر فراہم کیا اس میں انسانی قبیلوں اور قوموں کی پیکار کے علاوہ نظریوں اور خیالوں کی ایک مستقل پیکار بھی جاری دکھائی دیتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک ژولیدہ، غیر متعین اور تصادمات اور تضادات سے بوجھل دنیا تھا۔ اپنی مادّی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر بیسویں صدی کی دنیا کا شناس نامہ بہت بے ترتیب اور الجھا ہوا ہے۔ یہ ایک ناہموار، مشکل اور ناقابل عبور دنیا تھی جس کی فکری احاطہ بندی میں قدم قدم پر انتہا پسندی کے خطرے درپیش تھے۔ اسی لیے بیسویں کے تشخص اور تعبیر میں جذباتی اور فکری شدت، تعصب اور غلو کے آثار نمایاں ہیں۔ اپنے مرکزی وژن کی دریافت سے پہلے، اقبال جذبوں اور خیالوں کی ایک لمبی کشمکش کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ ان کے مجموعی مزاج کی تشکیل اور شعور کی تعمیر جن عوامل کے واسطے سے ہوئی تھی ان پر مشرقی دنیا اور مغربی دنیا کے واقعات کا سایہ یکساں طور پر طویل دکھائی دیتا ہے۔ حسّی اور ذہنی لحاظ سے یہ ایک دشوار گزار مہم تھی اور طرح طرح کی نظریاتی آزمائشوں سے بھرا ہوا ایک لمبا سفر۔ تاریخ کے جس سوالنامے سے حالی اور اکبر کا شعور دوچار ہوا تھا اس کی بہ نسبت اقبال اور ان کی دنیا یا گردو پیش کی زندگی کے مسئلے کہیں زیادہ گہرے اور صبر آزما تھے۔ اقبال نے یہ پورا سفر اپنی بصیرت کے

ساتھ ساتھ روشنی کی اسرار آمیز لکیر کی مدد سے طے کیا جس کا مخزن رومی کی ہمہ گیر ذات اور شخصیت تھی۔

۲۰۰۷ء کو عالمی پیمانے پر رومی کا سال قرار دیا گیا ہے۔ مشرق و مغرب میں رومی کی تفہیم و تعبیر کا ایک نیا سلسلہ جاری ہے۔ یورپ اور امریکہ کے مختلف شہروں میں ان کے نام پر ادارے اور اکادمیاں قائم کی جارہی ہیں اور یہ خیال عام ہے کہ اس وقت رومی کو مغربی دنیا میں فکری اور علمی سطح پر نمایاں ترین ادبی شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔ مشرق سے قطع نظر مغرب کی بہت سی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع کیے جا رہے ہیں۔ رومی کی پیدائش کو آٹھ سو برس گزر چکے ہیں اور پچھلی آٹھ صدیوں میں یعنی مولانا روم کی پیدائش کے سال ۱۲۰۷ء سے لے کر آج ۲۰۰۷ء تک مشرق و مغرب کی اجتماعی زندگی میں طرح طرح کے انقلاب آچکے ہیں۔ اس عرصے میں انسانی تاریخ کیسے کیسے طوفانوں سے دوچار ہوئی، زندگی کے کتنے مظاہر بنے اور مٹے، اقدار اور تصورات کی کتنی دنیائیں تاراج ہوئیں، کتنے آدرش ٹوٹے اور کتنے ایقانات سرنگوں ہوئے! یہ ایک عجیب و غریب اور ہولناک حقائق سے بھری ہوئی کہانی ہے۔ ایسی صورت میں اقبال جیسے ایک فرد کا رومی کے شعور سے رابطہ اور مکالمہ اور رومی کے شعور کی قیادت میں انسانی تہذیب کے گذشتہ اور موجود زمانوں کا دشوار گزار سفر، ہماری فکری اور تخلیقی رویات کا انوکھا اور نہایت منفرد واقعہ ہے۔ جاوید نامہ میں نئی نسل کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ:

بیر رومی را رفیق راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
شرح او کروند اورا کس نہ دید — معنئ او چوں غزال از مارمید
رقص تن از حرف او آموختند — چشم رازِ رقص جاں بردوختند
رقص تن در گردش آرد خاک را — رقص جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقص جاں آید بدست — ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
رقص جاں آموختن کارے بود — غیر حق را سوختن کارے بود

تو وہ اپنے ماضی کے نہیں بلکہ مستقبل کے روبرو ہوتے ہیں۔ اس طرح جاوید نامہ ماضی کے کرداروں کی شمولیت کے باوجود، دراصل ہمارے اجتماعی مستقبل کا خواب نامہ ہے۔ اقبال کے لیے رومی، گذشتہ میں ثبت ایک نقش نہیں ہے، آیندہ کے لیے ایک امکان اور بشارت کا ایک

زندہ جاوید نشان ہے۔ عصری صورت حال کے سیاق میں رومی کے مطالعے کی یہ روایت شبلی نعمانی کی کتاب سوانح مولانا روم سے شروع ہوئی تھی۔ اقبال نے اس روایت کو اپنے دور کی حقیقتوں سے مربوط کر کے، رومی کی معنویت کا ایک نیا تناظر، ایک نیا بُعد دریافت کیا۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دور فتنۂ عصر کہن اُو بہ دور فتنۂ عصر رواں من

عصر رواں کی زندگی کو ایلیٹ نے اپنی نظم میں ایک ارض المیت یا ایک خرابے کے طور پر دیکھا تھا۔ تاریخ نے اس زندگی کو جو زخم لگائے ہیں اور نئے معاشرے کے گُم کردہ راہ انسان نے آپ اپنے لیے جو مشکلیں پیدا کر لی ہیں اور بے چارگی کے جس بھنور میں خود کو گھیر لیا ہے، اس سے نکلنے کی کوئی صورت اگر ممکن ہے تو اس بھولے ہوئے سبق کے واسطے سے جو اقبال نے رومی کی فکر میں دریافت کیا تھا۔ اقبال اور رومی کی فکر میں زمانوں کے اختلاف کے باوجود مماثلتوں کے جو پہلو نکلتے ہیں، ان کی نشاندہی خلیفہ عبدالحکیم نے حسب ذیل خطوط پر کی تھی۔

۱۔ اقبال کے نظریۂ خودی کا بنیادی تصور رومی کے یہاں ملتا ہے ''عام صوفیا نے فنا اور ترک پر زور دینا عین دین بنا لیا تھا۔ رومی نے اس کو بقا کے نظریے میں بدل دیا۔'' رومی اور اقبال دونوں کے ہاں خودی کا استحکام لازمی ہے۔

۲۔ ''عجمی تصوف نے ترک حاجات کو خدا رسی کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ رومی کے نزدیک حاجت مصدر وجود اور منبع بہبود ہے۔ بشرطیکہ حاجات کہیں پست اور حیات کش نہ ہوں۔'' اقبال کے کلام میں جا بجا ایسے اشارے ملتے ہیں، خاص طور پر ان اشعار میں جہاں وہ خدا سے مکالمہ قائم کرتے ہیں۔ اور مکالمے کا یہ اسلوب ان کے فارسی اور اردو کلام میں اس قدر تسلسل کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اقبال کی پوری شاعری ہی انسان اور گرد و پیش کے مظاہر سے گفتگو کے ذریعے در اصل انسان اور خدا کے مابین ایک لامختتم گفتگو کی روداد بن گئی ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
روزحساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

سے لے کر

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

تک اسی گفتگو کا سلسلہ جاری دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے دائرے میں انسانی ماضی سے مستقبل تک کے تمام جانے انجانے تجربے سمٹ آئے ہیں۔

۳۔ اقبال کا عقل کی آفرینش کا نظریہ بھی رومی کے افکار سے مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں متاع آرزو کو عزیز رکھتے ہیں کہ آرزو کی وجہ سے ہی جذبوں کا تموج اور احساسات کا رقص کبھی نہیں تھمتا اور عقل آرزو کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ آپ اپنی تفہیم اور اپنے حال کی تعبیر کا بنیادی محرک بھی انسان کا عقلی شعور ہے۔

۴۔ رومی کی مثنوی میں مظاہر اور انسانی وجود کے ارتقا کا جو نظریہ ملتا ہے اس سے زندگی کے عناصر کی رفتار اور سمت کے بارے میں نئے تصورات کی تائید ہوتی ہے۔ رومی اور اقبال دونوں وجود کی بقا کے تصور میں یقین رکھتے ہیں۔ بہ قول اقبال۔

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

☆

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کو نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہِ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نارِ حیات

دونوں ارتقا کے قائل ہیں اور حقیقت کے ہمہ گیر یا مکمل ادراک کے لیے، دونوں کی فکر میں مستقبل بینی کا عنصر ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے کہ یہ کائنات اپنے موجودہ مرحلے میں ابھی ناتمام ہے۔ لہٰذا وجود پذیر ہے کہ ؎

''آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون''

انسانی ہستی کے تحرک کا انحصار بھی اسی یقین پر ہے۔

(۵)۔ یہ رومی اور اقبال دونوں کے یہاں عقل کے ساتھ ساتھ عشق کا مضمون بھی مشترک ہے۔ دونوں کے یہاں عقل اور عشق کے مقامات بھی ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ عقل عشق کا اولین مظہر ہے، عقل عشق کا آلۂ کار ہے اور شوق وذوق کی تکمیل اور طلب کا بنیادی وسیلہ عقل ہے۔ رومی کہتے ہیں:

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود
ایں فساد از خوردن گندم بود

اور اقبال جو معاشرے انسانی وجود کی توقیر کے لیے ''شکم کی مساوات'' کو کافی نہیں سمجھتے، تو اسی لیے کہ محض مادی وسیلوں کی دستیابی انسان کے سفر شوق کا حاصل نہیں ہے۔

(۶)۔ رومی اور اقبال دونوں جبر کے منکر ہیں اور تقدیر کی اس تعبیر کو رد کرتے ہیں جو انسان کے ذہنی اور جسمانی ارتقا کی رفتار کو روک دیتی ہے۔ بہ قول خلیفہ عبدالحکیم ''تقدیر، مولانا روم کے نزدیک، خدا کے معین کردہ آئین کا نام ہے۔'' انسان اپنے عمل صالح کے ذریعہ زندگی کی بساط پر حقیقی کامرانی اور مسرت سے دوچار ہوتا ہے اور مثبت نتائج تک پہنچتا ہے۔ یہی عمل غلط راستے پر پڑ جائے تو انسان گم راہ ہو جاتا ہے اور اس کی ہستی مائل بہ پستی ہو جاتی ہے انسان کی خودی کے

احساس میں اختیار کا پہلو اسی لیے ہمیشہ اپنی معنویت کی حفاظت کرتا ہے۔'''' کافر مجبور ہوتا ہے، مومن مختار ہوتا ہے''۔ چنانچہ جبر و اختیار کا یہ کرشمہ ہر زمانے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اسی کرشمے پر زندگی کی تعمیر اور تسلسل کا دارومدار ہے۔ مولانا روم نے اس سلسلے میں یہ استدلال کیا ہے کہ جبر و اختیار کا مسئلہ تو کُتے کو بھی معلوم ہے کہ جب کبھی کوئی اسے پتھر مارتا ہے تو وہ پتھر سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ اسے پتا ہے کہ پتھر تو مجبور ہے۔ البتہ مارنے والا مختار ہے اس لیے وہ مارنے والے کو کاٹ کھانا چاہتا ہے۔

بے شک، بال جبریل کی نظم ''مرید ہندی اور مرشد رومی'' میں اقبال نے رومی کو اپنا روحانی قائد، اپنا مرشد اور راہ نما تسلیم کیا ہے لیکن وہ تقلید محض کے قائل نہیں تھے۔ اسی لیے رومی کی مثنوی کے مضامین کی وسعت اور ان کے افکار کی جامعیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اقبال کے ذہن میں جاوید نامہ کی تخلیق کا خیال پیدا ہوا۔ ایک اعتبار سے جاوید نامہ انسانی ہستی کے اسی شوق فراواں کی تکمیل کا خواب نامہ ہے جس کا ظہور مثنوی کی تہہ سے ہوا تھا۔

☆

اپنے مضمون ''شاعری کی تین آوازیں'' میں ایلیٹ نے ان کے باہمی امتیازات کی نشاندہی اس طرح کی ہے کہ ایک آواز کا خطاب دوسری سے ہوتا ہے، دوسری کا اپنے آپ سے اور تیسری کا خدا سے۔ گویا کہ تخلیقی ادراک اور حسیت کے مزاج اور محور میں تبدیلی کے ساتھ بیان و اظہار کا آہنگ اور اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ اقبال کا کلام اپنی فکر اور سیاسی تہذیبی، معاشرتی مسئلوں کے بیان میں اپنے خاص موقف کے واسطے سے صاف پہچانا جاتا ہے۔ اقبال کی دوسری پہچان ان کا منفرد آہنگ، اسلوب اور ان کا غیر معمولی ذخیرۂ الفاظ ہے۔ جہاں تک ان کی بنیادی سروکاروں کا تعلق ہے تو اس ضمن میں اقبال کی دنیا بہت کھلی ہوئی ہے۔ حقیقت سے خواب تک، حاضر سے آیندہ تک، مادی اور ٹھوس تجربوں سے مابعد الطبعیاتی اور تجریدی فکر تک، اقبال کا تخلیقی تجربہ اور ان کا شعور ایک ساتھ کئی سمتوں میں سفر کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں انہوں شعور کے چند درجات کی نشاندہی کی ہے ان سے مجموعی طور پر انسانی شعور کے ایک ہمہ گیر اور مسلسل بڑھتے پھیلتے ہوئے دائرے کی تصویر ابھرتی ہے۔ کہتے ہیں:

شاہد اول شعورِ خویشتن　　خویش را دیدن نہ نورِ خویشتن

شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے خویش را دیدن نہ نورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذت حق خویش را دیدن نہ نورِ ذات حق

گویا کہ شعور کا پہلا درجہ اپنے آپ کو اپنی نظر سے دیکھنا اور اپنی خودی کے احساس کو اپنی شناخت کا وسیلہ بنانا ہے۔ یہ ایک وجودی نقطہ ہے اور انسان کی زندگی کے تمام تر سفر کا آغاز اسی نقطے سے ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ غیر ذات کا شعور ہے یعنی گرد و پیش کی اشیا، مظاہر، موجودات اور اسما کے واسطے سے زندگی کے ہر رنگ کو پرکھنے اور سمجھنے کی جستجو۔ اس طرح انسان اپنی انا کے غلاف میں محصور ہونے اور اپنے آپ کو محدود و متعین کرنے سے بچ جاتا ہے۔ شعور کا یہ درجہ ٹیگور کی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق ''انا کی کینچلی'' کو اُتار پھینکنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے اور فرد کے معاشرتی یا بیرونی رشتوں کو بھی مستحکم کرتا ہے۔ اقبال کی وجودی فکر میں انسان دوستی کا عنصر اسی واسطے سے آیا ہے۔ شعور کا تیسرا درجہ یا شعور کا درجہ، کمال فرد کی طبیعی دنیا اور مابعد الطبیعاتی کائنات کے مابین ایک پُل تعمیر کرنا ہے۔ بامعنی زندگی کے ساتھ ساتھ بڑی شاعری کے اسرار تک بھی ادراک کی اسی سطح پر رسائی ممکن ہے۔ ان تینوں درجات پر گرفت اور ان کے اجتماع سے ہی فرد کی ہوتی ایک کائنات اصغر کے طور پر اپنے آپ کو منکشف کرنے کی اہل ہوتی ہے۔ اسی درجے پر آفاق سمٹ کر ایک فرد کے وجود میں منتقل ہوتے ہیں اور زندگی کے ساتھ ساتھ کائنات کی وحدت کا شعور تکمیل کو پہنچتا ہے۔ خودی کے علاوہ عقل، عشق، عمل، انسانی اختیار کے تصورات کا ظہور بھی اقبال کے یہاں شعور اور ادراک کی اسی سطح پر ہوا ہے اور ''ہے'' میں ''چاہیے'' یا موجود حقیقت میں امکان کی وہ تلاش جس پر اقبال نے اپنے خطبات میں مفصل گفتگو کی ہے اور جس کی بنیاد پر شاعری میں انہوں نے اپنے بنیادی موقف کی تعمیر کی ہے۔ اس کا سارا پتا اور نشان بھی ہمیں اسی سطح پر ملتا ہے۔ شعور کی اسی سطح پر اقبال نے تاریخ سے مافوق التاریخ تک کا اپنا تمام تر راستہ طے کیا ہے۔

☆

جاوید نامہ میں افکار کی جو ہلچل، جو سرگرمی دکھائی دیتی ہے اور اقبال کے ذہن اور ان کی حسیت میں ہمیں جو مستقل بے کلی اور دل گرفتگی دکھائی دیتی ہے، دراصل اسی صورت حال نے اس نظم کو ایک عظیم الشان فکری مہم، ایک ہمہ رنگ سفرنامے میں انسان کی کائنات فکر کے بہت سے رنگ یکجا ہو گئے ہیں۔ وجود کا کوئی نقش، کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ اور اس مہیب ڈرامے میں

زمین اور آسمان، موجودات اور مظاہر کے بے شمار چہرے کرداروں کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ لیکن کسی بھی مرحلے میں، کہیں بھی کوئی افراتفری اور ابتری دکھائی نہیں دیتی۔ نیکی اور بدی، اجالے اور اندھیرے، فرشتے اور شیطان، ہیرو اور ویلن، اپنی باہمی کشمکش اور تضادات کے ساتھ تخلیقی تجربے کے ایک انوکھے مرکز پر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ اقبال نے ان میں سے ہر ایک کے رول کی ترجمانی ایک خاص معروضیت کے ساتھ کی ہے۔ وہ کسی کے رول میں نہ تو تخفیف کے مرتکب ہوئے ہیں اور نہ مبالغے کے۔ اس پر جلال آفاقی ڈرامے میں زمین سے لے کر مختلف افلاک و مقامات تک اقبال کا تخیل جن مرحلوں سے گزرتا ہے انہیں اقبال نے فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری اور فلک زحل کا نام دیا ہے۔ اس نقشے میں آفرینش کے پہلے روز سے لے کر افلاک سے پرے شانِ جلال کے ظہور تک کیسی کیسی بھید بھری دنیاؤں کے قصے شامل ہیں اور اقبال کی ملاقات کیسے کیسے جانے انجانے، دیکھے ان دیکھے کرداروں سے ہوتی ہے، ان سب کو اپنے شعور کی سطح پر مجتمع رکھنا بجائے خود ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اس گردوں شکار تخیلی کشادگی اور وسعت، شعور کی اس عظیم الشان گرفت اور ہمہ گیری، انسانی ذہن کی اس سحر انگیز بیداری اور طاقت کے پیش نظر جس کا اظہار جاوید نامہ سے ہوتا ہے اقبال کا ڈاکٹر تاثیر سے ایک ملاقات میں یہ کہنا کہ ''جاوید نامہ کو ابھی ابھی ختم کیا اور دل و دماغ نچڑ گئے ہیں۔'' (بہ حوالہ جناب محمد ظہیر الدین، جاوید نامہ، اشاعت ۲۰۰۷ء اقبال اکیڈمی حیدرآباد) سمجھ میں آتا ہے۔ اپنے فکری بلوغ اور دانشورانہ مرتبے کے لحاظ سے جاوید نامہ بلاشبہ اقبال کی زندگی بھر کے فکری تجسس اور ریاض، مطالعے اور تجربے کا حاصل ہے۔ اس کے مضامین میں جو پھیلاؤ اور تفکر میں جو فلسفیانہ گہرائی ہے اس کے لحاظ سے بیسویں صدی کی شاعری کا کوئی صحیفہ اس کے سامنے نہیں ٹھہرتا۔ اروبندو گھوش کی طویل انگیزی نظم ''ساوتری'' (اشاعت ۵۱۔۱۹۵۰ء) میں جدید انسان کی روحانی تفتیش اور اس کے سری اور مابعد الطبیعاتی تجربوں کا بیان بہت اسرار آمیز اور عارفانہ سطح پر کیا گیا ہے۔ اقبال اور اروبندو گھوش کا زمانی اور مکانی پس منظر بڑی حد تک مشترک ہے اور دونوں کے یہاں مغربی اور مشرقی تہذیب کی آویزش کا احساس بھی مشترک ہے۔ لیکن دونوں کے شعور کی جہتیں مختلف ہیں۔ اقبال نے اپنے ماضی اور حال کو تاریخ کے براہ راست اور حقیقت پسندانہ تناظر میں رکھ کر سمجھنا چاہا تھا۔ اروبندو گھوش نے اپنی بصیرت کو تاریخ کے متدائر (Cylical) تصور تک محدود رکھا، لہٰذا

اس یقین سے آگے نہ بڑھ سکے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور معاشرت کو انجام کار، اپنے ماضی کی طرف واپس آنا ہوگا کہ اس مراجعت میں ہماری نجات پوشیدہ ہے۔ اقبال آیندہ اور ارتقا میں یقین رکھتے تھے۔ اروبندو گذشتہ کی طرف واپسی میں۔ اقبال نے زندگی کی ٹھوس اور مشہور سچائیوں سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اروبندو کے لیے ہر ٹھوس حقیقت ایک مایا جال کا حصہ تھی، چنانچہ تاریخ کے بیک ڈراپ کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس ایک پردۂ مجاز کی تھی۔ اروبندو موت پر فتح یاب ہونا چاہتے تھے، اقبال زندگی پر ''تن کی دنیا'' کے حدود اور اس کی معذوریوں کا شعور اقبال بھی رکھتے تھے، لیکن وہ اس کی سچائی سے کبھی گریزاں نہیں ہوئے، اور انہوں نے عمل کو کبھی ترک کرنے اور دنیا کو تیاگ دینے یا رہبانیت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ خانقاہی تصوف اور متصوفانہ فکر کی عجمی روایت سے اقبال کی بیزاری کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ ہمیں زندگی کی سچائی اور انسانی ارادے اور عمل کی سچائی سے دور لے جاتے ہیں، جب کہ اقبال دنیا میں رہ کر اسے بدلنے اور بہتر بنانے پر زور دیتے ہیں اور اس واقعے کو تسلیم کرتے ہیں کہ علم و حکمت خیر کثیر ہیں۔ یہ حجاب اکبر نہیں ہے۔

زشر ستارہ جویم زستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

کا رمز اور مفہوم یہی ہے کہ انسانی جستجو اور عمل کی آزمایش ابھی ختم نہیں ہوئی اور یہ جستجو کبھی ختم نہ ہوگی کہ ۔ سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی! اقبال کا سارا زور، ان کی فکر کا تمام تر رخ تاریخ کے اگلے پڑاؤ، ہمارے اجتماعی مستقبل کی طرف ہے۔ آتش رفتہ کا سراغ پانے کھوئے ہوؤں کی جستجو کو قائم رکھنے کی ترغیب وہ اپنے آپ کو صرف اس لیے دیتے ہیں کہ کہیں زمان و مکان کی ادھوری حقیقت کو وہ پوری سچائی نہ سمجھ بیٹھیں اور ان کا ذہن تاریخ میں اتنا الجھ نہ جائے کہ اس کی مخفی اور مرموز سطحوں کے شعور سے وہ محروم ہو جائیں۔ گرد و پیش کی دنیا کو صحیح سمت پر ڈالنے سے پہلے، اپنی تربیت اور تہذیب ضروری ہے۔ رومی نے کہا تھا کہ ''میں نے قرآن سے اس کا مغز اٹھا لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے سامنے پھینک دی ہیں۔''

من ز قرآں مغزہا برداشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

اقبال کو بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کو خراب کرنے کی بہت بڑی ذمے داری ان

لوگوں پر عاید ہوتی ہے جو محدود عقلیت کے پرستار ہیں، اُن پیشہ ور ملاؤں اور خود ساختہ صوفیوں پر عاید ہوتی ہے جو ''قبر کی مٹی سے موتی نکالنے کا ہنر رکھتے ہیں'' اور جنہوں نے حقیقت کو خرافات کی نذر کر دیا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اقبال کی بصیرت اپنے تخیل کی ہم رکابی میں جس طول طویل سفر سے گزرتی ہے وہ دراصل ایک رفیع و جلیل تلاش کا سفر ہے۔ اس سفر کے دوران انسان کو تجربے کے جو ہفت خواں سر کرنے پڑتے ہیں اور جتنی مانوس و معلوم اجنبی انجانی دنیاؤں سے گزرنا پڑتا ہے اس کی تفصیل کئی جہانوں اور کئی زمانوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ جاوید نامہ کی مجموعی فضا میں، اسی لیے پیچیدگی، اسرار اور کشمکش کے عناصر کی فراوانی ہے۔ ایک مہیب تصادم، ایک شدید تناؤ اور ایک مسلسل امتحان کا ماحول زندہ رود کے کردار کو ہمیشہ سرگرداں اور متجسس رکھتا ہے اور بے چینی کی ایک مستقل کیفیت اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ وہی اس پُر ہول تماشے کا محور ہے اور اس مہیب ڈرامے کا مرکزی کردار۔ جاوید نامہ، بیسویں صدی کے دوران لکھا جانے والا اور اس دور کے پریشان فکر انسان کا پہلا رزمیہ بھی ہے۔ اسے اپنی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنے کھوئے ہوئے منصب، اپنے وجود کی غایت کی تلاش ہے۔ وہ اپنے آپ سے، اپنی حساس اور غیر حساس کائنات سے، اپنے خدا سے اس تعلق کی تجدید کا طالب ہے جو بے سمت اور بے راہ تعقل کی ضرب سے ٹوٹ چکا ہے اور جو ''اپنی حکمت کے خم و پیچ میں ایسا الجھا ہے کہ اپنے نفع و ضرر میں فرق کرنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھا ہے۔'' جو اپنے آس پاس حیران آنکھوں سے ٹوٹی ہوئی طنابیں اور بجھی ہوئی آگ کے ڈھیر دیکھ رہا ہے اور جسے یہ تک یاد نہیں کہ اس مقام سے کتنے کارواں پہلے بھی گزر چکے ہیں۔

آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اسی لیے اقبال اسے یاد دلانا چاہتے ہیں کہ

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در آرزو پوشیدہ است — اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو جان جہانِ رنگ و بوست — فطرت ہر شے امین آرزو ست
از تمنا رقص دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

رومی نے اسی رقص کو رقص جاں سے تعبیر کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ رقص جاں ہی افلاک کی برہمی کا سبب بنتا ہے اور اس رقص کی رو میں پہاڑ بھی ناچنے لگے ہیں۔ گویا کہ کائنات کا ہر مظہر، وہ حساس ہو یا غیر حساس، اس رقص کے احکامات کا تابع ہے۔

☆

پروفیسر اناماری شمل نے جاوید نامہ کو ''فکر و دانش کے ایک زبردست سرچشمے'' کا نام دیا ہے۔ مشرق فکر کی تخلیقی جہات نے یہ رفعت و جلال اور یہ درجۂ کمال جاوید نامہ سے پہلے کسی اور شاعر کے یہاں حاصل نہیں کیا تھا۔ اس اعتبار سے انیسویں صدی میں غالب کی تخلیقی جینئس (genius) کے بعد مشرقی تفکر، طرز احساس اور تصور حقیقت کا اگلا قدم ہمیں جاوید نامہ میں دکھائی دیتا ہے اور وہ بھی فکری تنظیم اور تفلسف کی اس سطح پر جہاں اقبال سے پہلے صرف رومی پہنچے تھے۔ اس لحاظ سے جاوید نامہ کو ہم مثنوی مولانا روم کا تکملہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نظم کی تشکیل اور تعمیر کے عمل میں رومی کے افکار کی شراکت ایک کھلی ہوئی سچائی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ جاوید نامہ ایک منظوم دستور العمل بھی ہے۔ بیسویں صدی کے سیاسی اور معاشرتی مسئلوں کے پس منظر میں، اور اس کے خطاب کا رخ، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، مشرق یا مسلمانوں کے واسطے سے پوری جدید دنیا کی طرف ہے۔

جاوید نامہ کے کرداروں اور ان کے الگ الگ تہذیبی، فکری حوالوں پر نظر ڈالی جائے تو اس نظم کے مرکزی تصور کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کرداروں میں رومی کو تو خیر زندہ رود کے دوست فلسفی اور رہ نما کی حیثیت حاصل ہے لیکن اقبال کے رویوں کو سمجھنے میں ان تمام مثبت اور منفی قسم کے کرداروں سے ہمیں مدد ملتی ہے جو اس بیانئے کو آگے لے جاتے ہیں اور فکری مزاج کا تعین کرتے ہیں۔ یہ کردار عارف ہندی (رشی وشوامتر)، جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا، مریخ کی ایک نبیہ، منصور حلاج، قرۃ العین طاہرہ، غالب، ابوجہل اور ابلیس، نطشہ، بھرتری، حضرت سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری، احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ اور سلطان شہید ٹیپو کے ہیں۔ ان میں جو تنوع اور اختلاف ہے اس سے زندگی کی مختلف سطحوں اور ایسے تمام رویوں کی نمایندگی ہوتی ہے جنھوں نے آب و گل کی دنیا کو خیر اور شر یا اندھیرے اور اجالے کی ایک مستقل رزم گاہ بنا رکھا ہے۔ اقبال کی اپنی ترجمانی زندہ رود کے کردار سے ہوتی ہے جو حیات انسانی اور اس کے ارتقا کا

ایک عالم گیر علامیہ ہے۔ جس کا کام اندھیرے اور اجالے کی دنیا سے بس گزرتے رہنا ہے۔ بہتا ہوا پانی جو زندگی اور توانائی کا ازلی اور ابدی استعارہ ہے۔ اس کی تہہ میں چھپے ہوئے اضطراب اور ہنگاموں کی خبر جاوید نامہ کے قاری کو اس کے سوالوں سے ہوتی ہے جن کا سلسلہ اس مسلسل بیانیے کے آغاز سے اختتام تک، جاری رہتا ہے۔ اور نقطۂ انجام پر پہنچنے کے بعد ہی پڑھنے والے کو اقبال کی ذہنی اور جذباتی ترجیحات سے اور سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی معاملات میں اقبال کے موقف سے آگاہی ہوتی ہے۔ بیشتر مقامات پر اقبال اپنے قاری کی نظر سے چھپے ہوئے، یا خاموش یا غیر جانب دار رہتے ہیں ۔ شاید اسی لیے مثبت اور تعمیری زاویوں کے ساتھ ساتھ منفی اور تخریبی زاویوں کی ترجمانی میں بھی اقبال کا اپنا لہجہ اور اپنا چہرہ کبھی ضرورت سے زیادہ تند و تیز یا بے حجاب نہیں ہوتا۔ نیکی اور بدی کے اسرار ایک سی سہولت کے ساتھ کھلتے ہیں۔ حزن و ملال اور سرشاری و نشاط کی کیفیتیں یکساں طور پر رونما ہوتی ہیں گویا کہ زندگی اور سچائی کا کوئی ایک طے شدہ اور سکہ بند رخ نہیں ہے۔ انسانی تجربات کی مالا میں اچھے برے، ہر رنگ کے منکے پروئے ہوئے ہیں اور حقیقت کے بسیط ادراک کے لیے انھیں ایک سی بصیرت کے ساتھ دیکھنا اور پرکھنا ضروری ہے۔ زندگی اور وجود کی وحدت اسی ہمہ گیری اور رنگارنگی کے واسطے سے اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ تاہم جس مرحلے میں اقبال کی اپنی پیاس بجھتی ہے اور ان کی تلاش ختم ہوتی ہے اس کا اظہار اقبال نے جاوید نامہ کے اختتامیے میں بہت واضح طریقے سے اور مدلل و مبسوط انداز میں کیا ہے۔ اس انداز پر کسی طرح کی شاعرانہ حکمت عملی غالب نہیں آسکی۔ ''نئی نسل سے باتیں'' کرتے وقت اقبال کا لہجہ خاصا دوٹوک، غیر مبہم اور نثری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال اپنے تخلیقی بیانیے کا خلاصہ نظم کر رہے ہیں اور ان کا سروکار اپنے تخلیقی تجربے سے زیادہ اپنی فکری جستجو اور روحانی تفتیش کے انجام کی وضاحت اور تشریح سے ہے۔

☆

جاوید نامہ کے فکری ماخذ کی فہرست بھی اقبال کے تخلیقی تجربے اور ان کے افکار کی پر پیچ روداد کی طرح طویل ہے۔ اقبال کے شعور کی جہات اور رفتار کا تعین تو ان احکامات کے واسطے سے ہوتا ہے جو اقبال کے عقاید کو اساس مہیا کرتے ہیں۔ قرآن اور اسلام کی حسیت اور شعور کا نقطۂ ارتکاز ہیں اور اقبال کا ذہن اسی دائرے میں گردش کرتا ہے۔ لیکن اپنے عقیدے کے ماخذ کی طرف اقبال کا

رویہ عام علماء کے برعکس بڑی حد تک غیر روایتی ہے۔ اپنے عقائد اور ایقانات کی روایتی تعبیر سے اقبال کے گریز کا سبب بھی یہی ہے۔ عقیدہ ان کے لیے صرف حد بندی کا کام نہیں کرتا، ایک فکری توانائی کا سرچشمہ بھی بنتا ہے اور زندگی، کائینات، وجود گردوپیش کی دنیا سے اور خدا سے انسان کے رشتوں اور رابطوں کی تفہیم اور تعمیر میں معاون بھی ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) میں، اپنے تعبیر میں معاون بھی ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنے خطوں میں مضامین میں ملفوظات اور شاعری میں جا بجا ان حقائق کی موروثی اور رسمی تعبیر سے انحراف کی راہ اپنائی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''نقوش اقبال'' میں شاید اسی انحراف کے باعث اس آرزومندی کا اظہار کیا ہے کہ کاش اقبال نے یہ خطبات نہ دیے ہوتے۔ اپنے فارسی اردو کلام میں اقبال ملاّ کے دین اور اس کی عبادت واشغال کا مذاق کھل کر اڑاتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو اس کے نقصانات سے خبردار کرتے ہیں۔ تعقل پر وجدان کو، بے روح عبادات پر مذہبی تجربے کو، روایت زدگی پر مہم جوئی کو اور تسلیم ورضا پر تسخیر کی طلب اور شوق فراواں کو اقبال جو ترجیح دیتے ہیں تو اسی لیے کہ زندگی جیسی کہ ہمیں میسر آئی ہے، اسے ارتقا پذیر اور متحرک اور کار کشار کھنے کے لیے، اس کے نئے امکانات کا سراغ لگانا انہیں دریافت کرتے رہنا ضروری ہے۔ دانش اور بصیرت کی یہ لہر اقبال کی سرشت میں صرف روایتی تصورات کے توسط سے نمودار نہیں ہوئی۔ اقبال نے اس کی ترتیب وتشکیل کے عمل میں اپنی دینی روایت اور پس منظر کے علاوہ دوسری روایتوں اور فکری سرچشموں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس معاملے میں وہ مشرق ومغرب کی تفریق کے بھی قائل نہیں تھے اور انہوں نے دونوں کے فکری سرمایے سے یکساں طور پر فیض اُٹھایا تھا۔

تاریخ کے عمل کی تفہیم اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے میں اقبال نے حالی اور سرسید سے لے کر اکبر اور ابوالکلام تک اسی لیے زیادہ اعتماد اور روشن نظری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ نہ مشرق سے مغلوب ہوئے، نہ مغرب سے مرعوب ہوئے۔ ان کی دانشوری، اپنی ترکیب کے اعتبار سے زیادہ بسیط ہے اور سرسید یا حالی یا اکبر کی دانشورانہ فکر سے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ جس پیغمبرانہ خود اعتمادی کے ساتھ اقبال نے مغرب کے تصورِ حقیقت اور مغرب کی مادّہ پرستی پر تنقید کی ہے یا جس بے لاگ طریقے سے وہ مذہب کے معاملے میں موروثی اور روایتی تنگ نظری پر تبصرہ کرتے ہیں اس سے اقبال کی فکر کے اجتہادی پہلوؤں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال کی شعوری مہم کا

آغاز رومی کی قیادت سے ہوتا ہے۔ رومی کی روح نمودار ہونے کے بعد سب سے پہلے معراج کے اسرار بیان کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی معراج کا واقعہ دراصل وقت اور مقام پر انسان کی فتح اور وقت کے حدود و قیود سے آزادی کی علامت ہے۔ یہی آزادی زمین اور آسمان کے تعلق اور ان کے اٹوٹ رشتوں کے ادراک پر منتج ہوتی ہے اور دوسری دنیاؤں سے روشناس ہونے کا راستہ دکھاتی ہے۔ نظم کے دیباچے میں ہی اقبال اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہمارا نشیمن صرف یہ عالمِ خاک و باد نہیں ہے۔ کائنات کی پنہائیوں میں، جو ستارے روشن ہیں، ان گنت ستارے، وہ ان گنت جہانوں کے وجود کی خبر دیتے ہیں۔ اس ادراک کے ساتھ اقبال جب اپنی سیاحت پر نکلتے ہیں تو سب سے پہلے فلک قمر پر جاتے ہیں جہاں چاند کے ایک غار میں ان کی ملاقات عارف ہندی رشی وشوامتر (جہاں دوست) سے ہوتی ہے۔ جہاں دوست اقبال کو نو نکات سمجھاتے ہیں زندگی، وجود، موت، وقت، کفر، ایمان، خواب اور بیداری، شعور کی تیسری آنکھ، پیدائش اور ارتقا اور اخیر میں جذب دروں جسے رومی نے رقص جاں کا اور اقبال نے عشق کا نام دیا ہے۔ ان نکات کی وضاحت اور اسرار کی نقاب کشائی کے بعد اقبال طاسین (تجلیات) کی وادی میں قدم رکھتے ہیں۔ اس وادی میں ان پر گوتم بدھ، زرتشت، حضرت عیسیٰ مسیح اور رسول اللہ ﷺ کی تجلیات کا باب طلسم کھلتا ہے۔ طاسین گوتم کا رمز رقاصۂ حسن فروش کی توبہ ہے، طاسین زرتشت کا رمز اہرمن کی آزمایش سے، طاسین مسیح کا رمز طالسطائی کے خواب سے اور طاسین محمدؐ کا رمز ابوجہل کے دکھ بھرے نوحے سے کھلتا ہے جسے اپنے موروثی دین کی تباہی اور اپنی روایت کے ٹوٹنے کا غم ہے۔ یہ تجربے ایک گہری ارضی اور انسانی اساس بھی رکھتے ہیں اور ان سے انسانی ہستی کے سب سے طاقت ور جذبوں کی نمایندگی ہوتی ہے۔ اقبال نے یہاں منصور حلاج کی کتاب الطّواسین تک خود کو محدود رکھنے اور صرف ایک مابعد الطبعیاتی سطح اختیار کرنے کے بجائے مختلف کرداروں کی تجلیات میں اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجلیات زندگی کی رنگارنگی اور اس کے مختلف النوع مطالبات اور تجربوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان میں بیک وقت انسانی احساس اور عمل، مظاہر کی ٹھوس اور تجریدی ہستیوں، حقیقت کے مختلف مدارج کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فلک عطارد پر جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقات کے بیان میں اقبال نے عقیدہ پرستی اور وطن پرستی، اشتراکیت اور بادشاہت، دین داری اور دنیاداری کے مضمرات اور

مراتب پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی فکر کے مزاج اور اپنے موقف کی ترجمانی جدید دور کی تاریخ کے معلوم اور معین حوالوں کے واسطے سے کی ہے۔ شاعری اور دانشوری کے تقاضے اقبال نے ایک ساتھ نبھائے ہیں۔ یہ صرف فکری اور فلسفیانہ شاعری یا صرف مذہبی شاعری نہیں ہے۔ یہاں اقبال کی تخلیقی شخصیت میں ایک مورخ، ایک فلسفی، ایک سماجی مفکر، ایک مصلح، ایک سیاست داں ایک دانشور کے اوصاف یکجا ہو گئے ہیں اور اس طرح یکجا ہوئے ہیں کہ کسی طرح پیوند کاری کا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی اور کائنات کی وحدت اور انسانی وجود کی وحدت کا شعور اقبال کی شخصیت کو یک خاص کشادگی، تنوع اور ہمہ گیری کا مظہر بنا دیتا ہے۔ اس سے جاوید نامہ کے مطالعے اور تعبیر کی کئی سطحیں ایک ساتھ سامنے آتی ہیں۔ امرتیہ سین نے اپنی کتاب تشخص اور تشدد (Identity and Violence) میں انتہائی معنی خیز نکتہ یہ پیش کیا تھا کہ ہم میں سے ہر شخص ایک ساتھ اپنی پہچان یا تشخص کے کئی زاویوں پر محیط ہوتا ہے۔ اکیلے اور واحد تشخص یا Single Indentity کا تصور بے معنی ہے۔ ہم ایک ساتھ کئی چیزوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اقبال جس دنیا کے باسی تھے اس کی کئی جہتیں تھیں۔ کئی سطحیں تھیں۔ کئی نام تھے اور ایک ساتھ بہت سے شناختی نشان تھے۔ اسی طرح اقبال کی اپنی شخصیت بھی اپنے تشخص کی کئی سطحوں اور سمتوں میں گھری ہوئی تھی۔ لیکن خود اپنے آپ کو مجموعۂ اضداد کا نام دینے کے باوجود، اقبال کی شخصیت مجموعۂ اضداد نہیں تھی۔ گوئٹے کا قول ہے کہ ہر لکھنے والا، اپنی بصیرت کے مطابق، اپنی دنیا اور اپنے معاشرے کے کسی حصے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے اور حقیقت کے ایک جز کو کھینچ نکالتا ہے۔ یہ جز کل نہیں ہوتا۔ اقبال نے اپنے عہد اور اپنے زمان و مکاں کی تعبیر میں ایک ساتھ جو اتنے مختلف واسطوں سے مدد لی ہے تو اسی لیے کہ ان میں سے ہر واسطہ حقیقت کے کسی نہ کسی عنصر کی تفہیم اور تعبیر میں ان کا معاون ہو سکتا تھا اور اقبال احساس خودی کے فیوض کا اعتراف کرنے کے باوجود انا گزیدہ نہیں تھے۔ جتنی پیچیدہ اقبال کی دنیا تھی، اتنی ہی پیچیدہ ان کی شخصیت اور ان کی شعوری زندگی بھی تھی اور اپنی تکمیل کے سفر میں طرح طرح کے تجربوں اور مرحلوں سے گزری تھی۔ جاوید نامہ کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اسے اقبال کے باطنی لینڈ اسکیپ اور ان کی روحانی آپ بیتی کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے، اقبال کی عمر بھر کے ذہنی اور جذباتی تجربوں، زندگی کی دھوپ چھاؤں کے تمام مظاہر کی دستاویز کے طور پر۔ جاوید نامہ کی شکل میں اقبال نے عصر حاضر کی بے

سمت اور بے راہ و مقام تہذیب کے خلاف ایک فکری محاذ قائم کیا ہے۔ اس محاذ پر اقبال نے آنے والی زندگی یا اپنے اجتماعی مستقبل کو بچانے کے لیے نئے پرانے، مشرقی اور مغربی ایسے تمام اسلحے جمع کیے ہیں جن سے زندگی اپنے بچاؤ کا کام لے سکے۔ بے لگام ترقی اور انفرادی آزادی کے نام پر جدید تہذیب کو جو اندیشے اپنے مستقبل سے لاحق ہیں، اقبال نے انہیں بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ فلک زہرہ پر اقوم قدیم کے خداؤں کی مجلس میں بعل کا گیت اور فلک مریخ پر شہر مرغدیں کی سیر کے دوران مریخ کی اس دوشیزہ کا قصہ جس نے نبوت کا دعوا کیا، ایک بے آب و بے نور ماضی اور ایک اندیشہ ناک مستقبل، دونوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مریخ کی نبیہ عورتوں کی آزادی کا علم اٹھائے ہوئے ہے اور ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھ رہی ہے جہاں وہ مردوں کے جبر سے پوری طرح محفوظ ہوں، اس حد تک کہ نسل انسانی کی بقا کے لیے بھی انہیں مردوں کا تعاون مطلوب نہ ہو۔ اقبال کے عہد تک تانیثیت کے تصور نے تحریک کی وہ صورت اختیار نہیں کی تھی جس نے جنسی اور اخلاقی سطح پر بھی مغرب میں کچھ نئے مسئلے پیدا کر دیے ہیں اور اب کہ یہ سیلاب مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے، مریخ کی نبیہ کے بہت سے اقوال، اقبال کی مستقبل بینی بلکہ پیغمبرانہ پیشین گوئی کی شہادت دیتے ہیں۔

فلک مشتری پر منصور حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی اضطراب آسا روحیں، جو بہشت میں قیام پر آمادہ نہ تھیں اور سکون و سکوت کی خاموش زندگی پر تجسس اور اضطراب سے بھری ہوئی گردش اور بے آرامی کو ترجیح دیتی تھیں، نئے انسان کی مہم پسندی اور مقدرات کی ترجمان ہیں۔ اسی فلک پر اقبال کی ملاقات ایک زوال پذیر ہیرو، (Fallen Hero) ابلیس سے ہوتی ہے۔ حلاج اسے ''خواجہ اہل فراق'' کا نام دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ابلیس کے انکار میں توحید کے اقرار کا رمز بھی چھپا ہوا ہے۔ لیکن اب وہ انسانوں کی دنیا میں اپنی مسلسل اور متواتر کامرانی سے تنگ آچکا ہے اور تھکا ہوا ہے۔ اسے انتظار ہے ایک ایسے مرد خدا کا جو اس کی حتمی شکست پر اپنی مہر ثبت کر سکے۔ بہ قول شخصے Nothing Fails like success ۔ کسی نہ کسی نقطہ پر کامیابی اور نصرت بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہی ہے۔ اقبال نے اپنی اردو اور فارسی شاعری میں ابلیس کو متعدد مقامات پر اپنا موضوع بنایا ہے اور اس کردار کے ذریعے جدید دور کی ذہنی، معاشرتی اور سیاسی کشمکش کے بہت سے زاویوں اور مسئلوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن جاوید

نامہ میں ابلیس کا کردار ایک نئے تناظر کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ یہاں اس مرحلے میں جب نظم اپنے اختتام کے قریب ہے، ابلیس کے نالۂ درد میں آنے والے دور کے لیے ایک امکان کی بشارت بھی چھپی ہوئی ہے۔ وہ خدا سے کہتا ہے کہ وہ انسانوں کی اطاعت شعاری اور پست ہمتی سے تنگ آچکا ہے۔ اسے کہیں کسی چیلنج کا سامنا نہیں ہے۔ موجودہ دور کی باگ ڈور جس انسانی وجود کے ہاتھ میں ہے اس کی فطرت خام اور اس کا عزم کمزور ہے اور ابلیس کے سامنے اس کی حیثیت بچوں کے ایک کھلونے سے زیادہ کی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں گناہ کی زندگی کا بھی بھلا کیا مزہ ہے۔ کاش ایک ایسا وجود سامنے آئے جو اسے سرے سے خاطر میں نہ لائے، جو ابلیس کا مطیع و فرماں بردار بننے کے بجائے اس پر غالب آنے کی طاقت رکھتا ہو۔ گویا کہ دنیا اس وقت زوال کی جس حد کو پہنچ چکی ہے اس میں اب اور گرنے کی، بکھرنے کی گنجایش نہیں رہی۔ جاوید نامہ میں ابلیس کا یہ اعترافی بیان اس نظم میں گریز کا علامیہ بھی ہے جہاں سے اقبال اس مجموعی روداد کے مرکزی خیال اس کے بنیادی مقصد کی طرف بڑھتے ہیں اور اس وجود موعود کی ممکنہ تصویر مرتب کرتے ہیں جس کا دنیا کو انتظار ہے۔ انسانی زوال اور مذلت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فلک زحل سے گزرتے ہوئے اقبال افلاک سے پرے جا پہنچتے ہیں۔ فلک زحل پر ہی ان کا تعارف ان ذلیل روحوں سے ہوتا ہے جنھیں دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا، جو ضمیر کو موت کی پیام بر ہیں۔ اسی عقبی پردے کی روشنی میں وہ اجالی اور تابندہ صورتیں نمودار ہوتی ہیں جن سے اقبال کے تصورات خودی، عشق، عمل اور اختیار کی ترجمانی ہوتی ہے۔ نطشہ سے شروع ہو کر یہ تذکرہ راجہ بھرتری ہری، امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی اور ملا غنی کشمیری، ناصر خسرو علوی اور سلطان شہید ٹیپو کے ساتھ اپنے خاتمے کو پہنچتا ہے۔ نطشہ کو اقبال نے ایک ''حلاج بے دار و رسن'' کہا ہے، ایک سالک جو اپنی راہ میں ایسا گم ہوا کہ اپنے مقام تک پہنچ نہ سکا۔ جو خود سے بھی ٹوٹا اور اپنے خدا سے بھی ٹوٹا۔ اس کے کام اور ناتمام وجود اور اس کے ادھورے نصب العین کی تکمیل بالآخر اُن برگزیدہ شخصیتوں کے واسطے سے ہوتی ہے جو جاوید نامہ کے بیانیے میں نطشہ کے بعد رونما ہوئے ہیں۔ یہ مجذوب فرنگی اقبال کی تلاش کے سفر میں آدھ راستے سے ان کا ساتھ یوں چھوڑ دیتا ہے کہ خود اس کی تلاش بھی پوری نہ ہو سکی تھی۔ مقام کبریائی سے وہ بے خبر گزر گیا۔

لیکن سفر کے دورِ آخر میں سلطان شہید ٹیپو کے ساتھ اقبال کا سلاطین مشرق کے محل جا پہنچنے

پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی روحوں سے مکالمہ، اقبال کی ایک خلقی کمزوری اور جذباتی ترجیح کا پتا دیتا ہے۔ یہ کمزوری تھی طاقت اور توانائی کے مظہر کے ایسے جادو کا اعتراف جو شخصی مجبوری کا حجاب بن جاتا ہے۔ اقبال نے طاقت کو ہمیشہ خیر سے مشروط رکھا اور اس کے اندھا دھند یا بے جا استعمال کی کبھی وکالت نہ کی، لیکن طاقت بجائے خود بھی اقبال کے لیے ایک فطری کشش رکھتی تھی، شاید اپنی صلاحیت تسخیر اور سرگرمی کی بنا پر۔ نادر شاہ اور ابدالی کی شخصیتوں میں اپنے مقصد سے مکمل وابستگی اور ان کی جرأت آزمائی میں اقبال کو ویسا ہی حسن دکھائی دیتا ہے جیسا ابلیس کے اعتماد، سرگرمی اور حوصلے میں یا مسولینی کے سینے کی فراخی یا اس کے طبعی انہماک میں۔ اسی طرز احساس نے ملٹن کے رزمیے ''فردوس گم شدہ'' (Paradise lost) میں شیطان کو ایک زبردست افسانوی کردار بنا دیا تھا اور ایسا اس حقیقت کے باوجود ہوا تھا کہ ملٹن مسیحی اخلاقیات اور نیکی کے تصور سے کبھی منحرف نہ ہوئے۔ جس طرح خودی کے تصور میں دلبری کے ساتھ قاہری کا ایک عنصر بھی موجود ہوتا ہے، اسی طرح طاقت، خیر سے مشروط ہونے کے بعد بھی، زبردستی اور جبر کے تصور سے یکسر آزاد نہیں ہوتی۔ اقبال کے پرسوز لہجے میں کہیں کہیں مجادلے کا آہنگ اور ان کے فکری نظام میں گہرائی کے باوجود بعض اوقات ایک سخت گیری کا پہلو اسی راستے سے در آیا ہے۔

اقبال کے طرز احساس اور تفکر سے نوعی اختلاف رکھنے والوں کے لیے جاوید نامہ کی فکری اور اخلاقی اساس پر معترضانہ نظر ڈالنے کا جواز بھی یہی صورت حال فراہم کرتی ہے۔ اقبال کے اردو مجموعوں میں ضرب کلیم کی حیثیت، اپنے مزاج اور مافیہ کے لحاظ سے ایک کتاب الفتاویٰ کی ہے۔ شاعری اور تخلیقیت کا پہلو بہت سی نظموں اور شعروں میں دب گیا ہے۔ بہت سے شعر کلام موزوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ شعر کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ جاوید نامہ کے کچھ حصے بھی اپنے قاری کے لیے بے مزہ اور کشش سے خالی ہیں۔ اس کے ایک سبب کی طرف تو پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ طویل نظم اپنی ہیئت کے اعتبار سے، شاعری کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ایک قسم کا فکری معروضہ ہوتی ہے۔ شاعر کے پاس جب تک وافر خیالات نہ ہوں کہنے کے لیے کچھ سامان نہ ہو، طویل نظم کے تقاضے پورا کرنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ اقبال محض شاعر نہ تھے۔ ان کی حیثیت ایک نظریاتی مفکر، ایک مخصوص نظام تصورات کے مفسر کی بھی تھی۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور امتیاز کو تسلیم کرنے کے لیے ان کے تمام خیالوں اور ان کے ہر موقف کی ہم نوائی ضروری نہیں۔ اپنے عہد

کی سیاست، اپنی فکری اور تہذیبی وراثت نے اقبال کے سامنے کچھ حدیں بھی کھینچ دی تھیں۔ اقبال اپنے حدود اور اپنے شخصی ایقانات، اپنی جذباتی ترجیحوں اور وابستگیوں کے ساتھ، اپنی عظمت کا نقش قائم کرتے ہیں اور اس سطح پر وہ ڈانٹے اور ملٹن اور ایلیٹ کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔ جاوید نامہ کی شاعری نہ تو خالی خولی ادبی معیاروں کی گرفت میں آسکتی ہے، نہ صرف اس کے مضامین اور مقدمات کی بنیاد پر اس کی تعیین قدر ممکن ہے۔

☆

ہر زمانے میں ادب کی طرح، اقبال کی شاعری کے مفاہیم اور معنویتوں کا تعین کرتے وقت یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اپنے زمانے کے معاملات سے ان کی شاعری کا تعلق کتنا اور کیسا ہے۔ کوئی بھی لکھنے والا اپنے آپ میں مکمل نہیں ہوتا۔ پر اس پر اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کا دباؤ بھی ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی حسیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اسے اس طور پر بھی دیکھا جاتا ہے کہ اپنے عہد کے واقعات اور حالات سے اس نے کیا اثرات قبول کیے ہیں۔ اس کے انسانی سروکار کیا ہیں۔ اس کے اظہار و اسلوب میں اپنے دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اس کا اخلاقی موقف کیا ہے۔ شاعر کے موضوعات، اس کا ذخیرۂ الفاظ، اس کے بیان کا محاورہ، لہجہ، ان سب کے پیچھے شاعر کا ذہن اور اس کے اخلاقی رویے سرگرم کار ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے ساتھ جاوید نامہ کے اختتامیے کا مطالعہ، دراصل ان فکری اور سماجی محرکات کا مطالعہ بھی ہے جو اس نظم کی تخلیق کا سبب بنے۔ اقبال اپنے عہد کی سیاست، معاشرت، فکر اور صورت حال کے صرف خاموش تماشائی نہیں تھے۔

نظم کے ساتھ اقبال نے اختتامیے کی صورت میں عصر حاضر کی روح کے علاوہ آپ اپنی روح سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ جاوید نامہ کا یہی پہلو ہمارے عہد میں اس نظم کی قدر و قیمت اور مفہوم کے تعین کی اساس فراہم کرتا ہے۔ یہ پہلو اسے ماضی کی نظم نہیں بننے دیتا۔ جاوید نامہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر مشرق و مغرب کی کئی زبانوں کا ادب پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ اردو میں اس کے متعدد ترجموں کے علاوہ جاوید نامہ کے بنگالی، پنجابی، سندھی، براہوی اور پشتو تراجم کا تذکرہ پروفیسر سید سراج الدین نے اپنے آزاد ترجمے کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ مشرق کی ادبی روایت کے امتیازات اور اس کی روایت کی عظمت کا شعور مغرب میں زیادہ عام نہیں ہے۔ تاہم

اقبال کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں کے یہاں جاوید نامہ کی طرف خصوصی توجہ کا میلان پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب جاوید نامہ میں بیسویں صدی کے ذہنی اور جذباتی ماحول اور اس عہد کے بنیادی مسئلوں کی گونج ہے۔ جس بڑے کینوس پر اور جس تفصیل کے ساتھ اقبال نے اس نظم میں تاریخ کے ایک پورے دور کا احاطہ کیا ہے، وہ حیران کن ہے۔ کچھ اس لیے بھی کہ یہ دور اپنی ذہنی پراگندگی اور ریزہ خیالی سے پہچانا جاتا ہے اور بڑے تجربوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اس دور کے ادب میں عام نہیں ہے۔ جاوید نامہ میں دیومالاؤں اور پرانے رزمیوں کا جلال ہے اور دیوزادوں کی وسعت خیال۔ خود اقبال کے نزدیک یہ نظم ''ایک طرح کی ڈیوائن کامیڈی تھی اور اسے مولانا روم کے طرز پر لکھا گیا تھا۔'' یہاں اقبال نے مغرب اور مشرق، دونوں کی تخلیقی روایت کے عظمت آثار نمونوں سے یکساں طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی تخلیقیت کے انفرادی عناصر کی شمولیت سے جاوید نامہ کو ڈانٹے اور رومی، دونوں سے آگے کی انسانی صورت حال تک لیجانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بہ قول عزیز احمد، اس ہمہ گیر کوشش نے جاوید نامہ کو اقبال کا سب سے دوررس اور عمیق شعری کارنامہ بنا دیا ہے۔

جاوید نامہ کا آخری باب اقبال کے مجموعی نظام افکار کی روشنی میں مرتب کیا جانے والا دستورالحیات ہے جسے وہ نئی نسل کے واسطے سے اپنے مستقبل پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس دستور کی شروعات یہاں سے ہوتی ہے کہ اقبال نے جاوید نامہ میں ابھی تک جو کچھ کہا تھا وہ صرف سخن آرائی ہے کہ ابھی تک انکے دل کی بات ان کے ہونٹوں پر نہیں آئی ہے۔ دل کی اس بات کا محرک ایک گہری آرزومندی ہے، روح میں رچی ہوئی اور اسی آرزومندی نے اقبال کے باطن کو بے قرار اور گداز کر رکھا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عقیدہ اگر صرف ایک موروثی تجربہ بن کر رہ جائے تو وجود منور نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک روحانی تگ ودو بھی ضروری ہے۔ اس تگ ودو کا مرکزی نقطہ کلمۂ لا الٰہ ہے۔ یہ انسانی شعور کا اعلانیہ بھی ہے جس کے ساتھ انسان کی جان کو لگے ہوئے تمام واہمے معدوم ہو جاتے ہیں۔ لا الٰہ کا سوز مہر و ماہ میں ہے۔ کوہ و کاہ میں ہے۔ اسی کی ضرب سے انسان باطل پر فتح یاب ہوتا ہے اور غیر اللہ کے خوف سے آزاد۔ گویا کہ کائنات کی تعمیر کا بنیادی راستہ خودی کی تعمیر سے ہو کر جاتا ہے۔ اقبال کی فکر کا وجودی نظام اسی رمز پر قائم ہے۔ اس لحاظ سے بیسویں صدی میں رونما اور مروّج ہونیوالے وہ تمام تصورات اور نظریے جو اجتماعی مقاصد کے نام

پر ایک طرح کی فردکشی کے مرتکب ہوتے ہیں، اقبال کی وجودی فکر سے کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتے۔ اقبال ایسے تمام ''تازہ خداؤں'' کے منکر ہیں۔ وطن پرستی، علاقائیت، رنگ ونسل، زبان، قومیت، اسی طرح جدید انسان کی ذہنی قیادت کا دعوا کرنے والی طاقتیں، سائنس، ٹکنالوجی، جمہوریت، یہ سب کی سب دیو استبداد کی نئی صورتیں ہیں۔ لا اِلٰہ کا سبق بھلانے سے انسان نے اپنی ذات بے نور، اپنی کائنات بے شعور کرلی ہے اور اب پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے۔ سجدہ بھی جب محض رسم دیں بن جائے اور شکوہ ربی الاعلیٰ کے احساس سے عاری، تو اپنا مفہوم کھو بیٹھتا ہے۔ جدید دنیا کی بے راہ روی، بے زمامی کا اصل سبب ہی محرومی ہے۔

اس حال کا اگلا قدم جو مستقبل کی دہلیز پر پہنچے گا اس کا انجام بھی معلوم ہے تاوقتے کہ جدید انسان اپنے ارتقا کی رفتار اور سمت پر قابو نہ پا جائے۔ فطرت کی اندھا دھند تسخیر کے نشے میں، عقل مزید بے باک ہوگی، دل پہلے سے زیادہ بے گداز، آنکھ ابھی اور بے شرم ہوگی۔ ہستی ابھی اور زیادہ ضعیف ہوگی اور غرق مجاز۔ جدید علوم اور فنون، سیاست، عقل اور دل، سب کے سب گرفتارِ جہانِ آب وگل ہیں۔ ہمارے عہد کے سماجی مفکرین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مادّے کی آمریت کے احساس میں اب کمی آرہی ہے۔ سائنس کے غرور بے جا کی شکست اور ٹکنالوجی کی ہلاکت کے شعور نے حقیقت کے رائج الوقت تصورات پر ضرب لگائی ہے۔ جدید طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے مابین ایک نظری پل تعمیر کیا جا چکا ہے۔ اب نہ مادہ یکسر بے روح ہے نہ روح جسمیت اور ٹھوس پن کے عنصر سے اس طرح خالی ہے جیسی کہ عقلیت، سائنس اور ٹکنالوجی کی نازش بے جا کے دور میں سمجھی جاتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کے ادب میں مشرق کی سرّیت اور روحانی تہذیب کے تصور میں آگے کا راستہ ڈھونڈنے اور ایک نئے مابعد الطبیعیاتی نسخے کو آزمانے پر جو زور دیا جارہا تھا، تو اسی لیے کہ کچھ لکھنے والوں نے مادی تہذیب کی نارسی اور اس کے ادھورے پن کو سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ انسانی مستقبل کے شعور کی تشکیل مغرب کے بجائے اب مشرق کے واسطے سے ہوگی۔ یہی شعور انسانیت کا ماضی ہے۔ یہی اس کا مستقبل بھی ہوگا۔ جاوید نامہ میں اقبال صاف طور پر کہتے ہیں کہ ''ایشیا، جائے طلوع آفتاب'' ہے گرچہ اس نے اپنے آپ سے حجاب کر رکھا ہے۔ اس کا دل خالی ہے۔ اس کا زمانہ ٹھہرا ہوا۔ اس کی زندگی ذوق سیر سے محروم اور حق ناشناس امیروں اور بادشاہوں اور ملاؤں کا شکار رہے۔ مشرق کے

موجودہ ماحول میں فکر کی بے دمی، عقل و دل کے کھوئے ہوئے ناموس ونگ کے باعث ہے۔ اس کا دوسرا سبب آداب فرنگ کی اندھی پیروی اور تقلید ہے۔ مغرب نے جس صارفی کلچر کو فروغ دیا ہے اس کا اقتدار مشرق میں بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ جاوید نامہ کے فکری نظام کا یہ نکتہ اس لحاظ سے بھی غور طلب ہے کہ ہمارے عہد میں تہذیبی تجدد پرستی، نشاۃ ثانیہ، فکری جدیدیت، ترقی پسندی، مابعد جدیدیت کی بحثوں کے دوران، اب اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان معاملات میں اہم مغرب کی کورانہ تقلید سے بچیں اور اپنی روایت، سرشت اور تاریخ کے سیاق میں ان کے مفہوم کا تعین کریں۔ ہماری جدیدیت اور ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کے عناصر اور تقاضے مغرب سے الگ ہونے چاہئیں۔ اسی لیے مغربی نشاۃ ثانیہ کو اب ہندستان کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا آدرش تسلیم کرنے کی روش ترک کی جا چکی ہے۔ اقبال ہر تصور کی طرح اس تصور کو بھی ''انفرادی انا'' اور ''احساس خودی'' سے مشروط سمجھتے ہیں اور مغرب کے عالم افکار کو اعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں۔ مغرب سے مقابلہ آرائی کے دو اسالیب اقبال نے اختیار کیے تھے۔

ایک کو انہوں نے ''حرف پیچیدہ'' کا نام دیا۔ دوسرے کو ''نالہ مستانہ'' کا۔ یعنی کہ آگہی کی دونوں سطحوں پر، اپنے شعور اور اپنے جذبات دونوں کے واسطے سے وہ مغرب کے طرز احساس اور اقدار کو اپنا ہدف بناتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مشرق کی نئی نسل (یا مستقبل) کے تشخص کی تعمیر کے لیے ''حرف پیچیدہ'' اور ''نالۂ مستانہ'' دونوں کی ضرورت ہے۔ عقل اور عشق دونوں کا واسطہ درکار ہے۔ یہ دونوں نئی نسل کا ورثہ ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا بھی ضروری ہے اور انہیں یکجا کرنا بھی کہ سچی آگہی بھی جذبے سے خالی نہیں ہوتی۔ اقبال ایک نیا ہنگامہ بپا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نئے عصر اور مزاج عصر کے متلاشی ہیں جہاں ہمارے نوجوان ''کم نگہ اور ناامید اور بے یقین'' نہ ہوں، آپ اپنے منکر نہ ہوں، غیر کو اپنا مرشد نہ بنائیں۔ اپنے مدرسے اور اپنی تربیت کا مقصود ایک ایسے ''آیندہ'' کی تشکیل کو بنائیں جو جذب دروں کی اہمیت اور قدر و قیمت سے بھی آگاہ ہو۔ شاہین کے بچوں کو بطوں کی تربیت سے کچھ نہ ملے گا۔ علم کی اساس سوز حیات پر ہے اور سوز حیات کے بغیر لطف واردات ہاتھ نہیں آتا۔ علم صرف شرح مقامات نہیں ہے۔ صرف تفسیر آیات نہیں ہے۔ علم کی حقیقت تک رسائی صرف شعور کی مدد سے ممکن نہیں۔ سچا سبق وہ ہے جو اپنی بصیرت کی دریافت ہوتا ہے۔ جو حواس پر نشہ طاری کر دیتا

ہے۔ جو ''رقص جاں'' کا حاصل ہے۔ بادسحر وہ ہے جس کے فیض سے پھول چراغ بن جائیں۔ جس کی مے کے لیے لالہ وگل ایاغ بن جائیں اور یہ منصب جلیل اپنی ہستی کے طواف کا محتاج ہے

.....

ہے وہی بادِ سحر گُل جس سے ہوتا ہے چراغ
جو کہ بھر دیتی ہے مے سے لالہ وہ گُل کے ایاغ
کم خورد کم خواب و کم خوراک رہ
گرد اپنے محوِ گردش .....
صورت پرکار رہ

(جاوید نامہ، اردو ترجمہ سید سراج الدین)

انا کا مثبت شعور دل و دماغ کے لیے شفا اور صحت مند ہوا کی طرح ہے۔ اسی لیے اقبال، یورپ کی زندگی کے براہِ راست مشاہدے اور مغربی تہذیب کے اندرونی تضادات، اور اس تہذیب کی معذوریوں اور نارسائیوں کا احساس رکھتے ہوئے بھی، انسان کے اختیارات اور انا کے شعور کی برکات کے انکاری نہیں ہوئے۔ جاوید نامہ کی فکری کائنات میں آپ اپنی ہستی کے شعور کی حیثیت مرکزی ہے۔ مغرب اس اعتماد سے یکسر محروم تھا، خاص طور پر پہلی جنگ عظیم کے بعد کا مغرب جس کے ملنے سے انسان کی بے بسی، تنہائی، بے اختیاری اور بے رہ روی کی ایک نئی روایت کا ظہور ہوا تھا۔ اس رویے کو مشرق و مغرب کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب میں ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ سے تحریک ملی تھی۔ ہماری اپنی ادبی روایت میں اس رویے کی سب سے نمایندہ مثال عمیق حنفی کی طویل نظم سند باد ہے جس کا مرکزی کردار اپنے آپ کو ''شہر لاالٰہ'' میں بالکل تنہا اور بے بس پاتا ہے اور اپنی روحانی اوڈیسی کے خاتمے پر ''اپنے افریقۂ ذات'' کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح اس کا سفر اندھیرے سے اندھیرے تک کا سفر ہے۔ اور گرچہ وجودی فکر کے نشانات اس پوری روداد میں بھی نمایاں ہیں، لیکن وجودی تجربے کی یہ تعبیر جو متعدد نئے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی فکر کی محور بنی، جاوید نامہ میں اقبال کے اس موقف سے تمام تر مختلف ہے جس کا اظہار جاوید نامہ کے اختتامیے میں کیا گیا ہے۔ اقبال خودی کے اثبات کو دراصل ایک نئے ایقان تک رسائی کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا اپنی ہستی (خودی کے) اس جوہر کی حفاظت کا

سند یسہ بھی دیتے ہیں اور اس جوہر کی حفاظت کے لیے بے خوفی، خلوص عمل، عدل اور اعتدال کی روش پر قائم رہنا ضروری سمجھتے ہیں .....

حکم ہو دشوار تو
قلب تیرا ہی تری قندیل ہو
حفظ جاں کا ہے وسیلہ ذکر و فکر
حفظ تن کا ضبط نفس
حفظ جان و تن نہ ہو تو حاکمی
دنیا کی ہاتھ آئی نہیں
ہے سفر کا لطف مقصود سفر
لطف اڑنے میں نہیں گر آشیاں پر ہو نظر
چاند تو ہے محو گردش تا کہ حاصل ہو مقام
پر قیام آدم کے حق میں ہے حرام
زندگی بس لذت پرواز ہے
آشیاں اس کے لیے ناساز ہے

(جاوید نامہ، اردو ترجمہ ایضاً)

اقبال ہر اُس رویے کے مخالف ہیں جو اپنے حال سے خوف زدہ، اپنے مستقبل سے مایوس اور انسان کے وجود یا اس کی کائنات میں مضمر امکانات کا معترف نہ ہو۔ مجہول قسم کی مذہبیت یا روایتی تصوف، قبر پرستی اور خانقاہیت، اسی طرح محفوظ زندگی کی خاطر ذخیرہ اندوزی اور حرص و ہوس یا ضرورت سے زیادہ کی طلب کو وہ مہلک قرار دیتے ہیں۔ قناعت، توکل، ضبط نفس، اکل حلال اور قول صادق کا راستہ خودی کی پرورش اور حفاظت کا راستہ ہے۔ کوشش تعمیر کو جاری رکھنے، حرکت اور سفر کی روح کو زندہ رکھنے کا راستہ ہے۔

دیں سر پا سوز اور ذوق طلب
انتہا عشق، ابتدا اس کی ادب
رنگ اور بو سے ہے گُل کی آبرو

بے ادب، بے آبرو، بے رنگ و بو
نوجواں دیکھوں جو کوئی بے ادب
دن بھی ہو جاتا ہے میرا مثل شب
دل میں اک ہنگامہ ہوتا ہے بپا
یاد آ جاتا ہے عہد مصطفیٰؐ
شرم آتی ہے خود اپنے عہد سے
اور کچھ کھوئے ہوئے قرنوں میں کھو جاتا ہوں میں

(جاوید نامہ، اردو ترجمہ ایضاً)

اپنے اس موقف کے ساتھ اقبال بشر دوستی کے ایک ہمہ گیر تصور تک پہنچتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کے چند بنیادی امتیازات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کے اجتماعی ماضی یا تاریخ اور بیسویں صدی کی انسانی صورت حال سے ہوتے ہوئے اقبال جاوید نامہ میں بالآخر جس شعوری منطقے تک پہنچتے ہیں، وہ مغرب میں پندرہویں صدی کے ساتھ رونما ہونے والے انسان دوستی کے تصورات سے مختلف ہے۔ سائنس، حکمت، فلسفے، منطق اور تعقل پر اقبال کی فکر ویسا اور اس طرح کا انحصار نہیں کرتی جو مغربی نشاۃ ثانیہ کے عام نمایندوں کا شیوہ تھا۔ اقبال ''تن کی دنیا'' سے آگے بھی دیکھتے ہیں اور ''مادی دنیا کی مابعد الطبیعیات'' کو بھی اسی طرح قبول کرتے ہیں جس طرح نئے انسان کے زمینی اور دنیوی معاملات کو۔ انسانی تاریخ میں بیسویں صدی، تصوراتی سطح پر، عالمی ادب یا World literature کی پہلی صدی تھی۔ اس وقت ہمارے ملکی منظر نامے پر صرف دو ایسی ادبی شخصیتیں تقریباً ساتھ ساتھ ابھریں جنہوں نے ہندستان کو علمی تناظر میں اور انسان کو ایک عالم گیر وحدت کے تناظر میں دیکھنے دکھانے کی کوشش کی۔ یہ شخصیتیں اقبال اور ٹیگور کی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ ٹیگور نے خود کو اقبال کا حریف سمجھے جانے کی ایک عامیانہ روش کی صاف لفظوں میں تردید کی تھی اور کہا تھا کہ ہم دونوں انسانیت کے خادم اور نمایندے ہیں۔ اقبال اور ٹیگور دونوں اپنے اپنے ذاتی عقائد کے اعتبار سے، ثقافت اور تہذیبی روایت کے اعتبار سے، انفرادی تشخص اور میلانات کے اعتبار سے، ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ ایک کے باطن کا قرآن کا بخشا ہوا تھا۔ دوسرے کا ویدانت

کا۔لیکن دونوں اپنے اپنے طور پر وجود کی وحدت اور کائنات کی وحدت کے قائل تھے۔اقبال نے انتقال سے پہلے، اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں جسے ان کے آخری اعلانیے یا Declaration کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے، انسان دوستی (Humanism) کے اپنے تصور کی کھل کر وضاحت کی تھی۔(اپنے ایک مضمون میں اس تقریر کا میں مفصل جائزہ لے چکا ہوں) ہمیں جاوید نامہ کے اختتامیے میں بھی انہی تصورات کی گونج سنائی دیتی ہے:

حرف بد کہنا کسی کو ہے خطا
کافر و مومن ہیں سب خلق خدا
آدمیت احترام آدمی
دھیان میں رکھنا مقام آدمی
عشق کے بندے کا اللہ کا طریق
کافر و مومن پہ وہ یکساں شفیق
کفر و دیں دونوں ہوں تیرے
دل کی پہنائی میں ضم
وائے وہ دل جو گریزاں دل سے ہو
دل اگرچہ ہے اسیر آب و گل
ساری دنیا ہے مگر دنیائے دل

.....

جس کی گرمی تیرے جان و دل میں ہے
تیرے آبا سے ملی ہے تجھ کو وہ
دیرینہ مے
دہر میں جز درد دل کچھ بھی نہ مانگ
مانگنا جو ہے خدا سے مانگ
سلطاں سے نہ مانگ

(جاوید نامہ، اردو ترجمہ ایضاً)

لیکن ''وحدت انسانی'' کا یہ تصور گلوبلائزیشن کے اس تصور سے بھی مناسبت نہیں رکھتا جس کی داغ بیل اقبال کے دور میں پڑ چکی تھی اور جس نے ہمارے دور میں ایک رائج الوقت سکّے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ بے شک ہمارے دور تک آتے آتے ثقافتی سطح پر یک جہتی کے آثار پہلے سے زیادہ نمایاں ہوئے ہیں اور غیر اشتراکی معاشروں میں بھی انسانوں کے درمیان ربط و تعلق کی نئی شکلیں رونما ہوئی ہیں، لیکن اشتراک باہم کا یہ سلسلہ اُس انسانی وحدت پر منتج نہ ہو سکا جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ درجات کے فرق، معاشی استحصال اور قومیت کے محدود مقاصد نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور بھی کیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے مغربی تصور نے انسانی کائنات کے پورے تناظر کو محدود کر دیا ہے۔ اس کی وسعت چھین لی ہے اور دنیا کو تماشا بنا دیا ہے۔ یہ تصور ترقی کے نام پر انسانوں کی رنگا رنگی کو ختم کر دینے اور ایک بازاری اور صارفی ثقافت کو فروغ دینے کے درپے ہے۔ گلوبلائزیشن کا فلسفہ خاص کر یک قطبی دنیا (Unipolar world) کے ظہور کے بعد تمام سرحدوں اور امتیازات سے انکار کا اعلان کرتا ہے۔ ذہنی اور مادی ، دونوں سطحوں پر گلوبلائزیشن کا مقصد ایک محدود جغرافیائی وحدت کا قیام ہے اور اس کے سامنے کوئی قابل لحاظ اخلاقی نصب العین نہیں ہے۔ تاریخ کے کونوں کھدروں میں سانس لینے والے، کمزور نہتے اور بے بس، بے اختیار طبقے رفتہ رفتہ اپنی رہی سہی توانائی بھی کھوتے جا رہے ہیں۔ عالم کاری کے نام پر اپنی مقامیت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور گلوبلائزیشن کا سارا سلسلہ غالب اور حکمراں اور اقتدار سے مشرف ملکوں، قوموں، گروہوں اور طبقوں کا کھیل بنتا جا رہا ہے۔ یہ ایک نئی قسم کی نوآبادکاری (Colonization) ہے، اقتدار کی توسیع پسندی اور استحصال کی سیاست کا نیا کھیل.....

جاوید نامہ کے آخری صفحات میں اقبال نے اشیا کے ہجوم، بازاری معیشت اور صارفیت کی مذمت بہت شدت کے ساتھ کی ہے۔ یہ وبا مغرب سے جدید ٹکنولوجی کی وسعت اقتدار کے ساتھ چلی اور اب مشرق کے آنگن تک آ پہنچی ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

ان گنت مردان حق اندیش کو
دولت وثروت نے اندھا کر دیا
کثرت نعمت سے ہو جاتا ہے گم دل کا گداز

ناز بڑھ جاتا ہے گھٹتا ہے نیاز
مدتوں گھوما ہوں میں گرد جہاں
کم ہی نم دیکھی ہے چشم منعماں
میں فدا اس پر کہ جس کی زیست درویشانہ ہے
حیف اس کی زیست جو اللہ سے بیگانہ ہے
اب مسلماں میں وہ ذوق وشوق، رنگ و بو نہ ڈھونڈ
علم قرآں سے ہیں عالم بے نیاز
صوفیوں کے ہیں فقط گیسو دراز
خانقاہوں میں ہے ہائے وہو، مگر صہبا نہیں
وہ مسلماں جن کے دل میں ہے بسا
مغرب کا خواب
چشمۂ کوثر سمجھتے ہیں اسے
جو ہے سراب
(جاوید نامہ، ترجمہ ایضاً)

گویا کہ مشرق، جسے مغرب کا نجات دہندہ بننا تھا فکر اور زیست کیا یک مختلف اسلوب کے طور پر اب خود بھی سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے ۔ یہ ایک معکوس ترقی ہے۔ برختین (Brechtian) محاورے میں ایک ''عروج کا زوال'' اور مغرب کے بعد اب مشرق کی سرزمین بھی ''ارض المیّت'' بنتی جارہی ہے۔ ایلیٹ کے ویسٹ لینڈ (خرابے) کی یہ ایک نئی شبیہ ہے۔

حاصل کلام کے طور پر اقبال پھر رومی کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ مغز اور پوست کے فرق سے آگاہ تھے۔ اور اسی لیے.....ان کے قدم
محکم تھے کوئے دوست میں
شرح کی ان کی، کسی نے پر انہیں دیکھا نہیں
ان کے معنی تک کوئی پہنچا نہیں

رقص تن تو ان سے سیکھا
رقص جاں سیکھا نہیں
رقص تن گردش میں لا دیتا ہے فرش خاک کو
رقص جاں وہ ہے ہلا دیتا ہے جو افلاک کو
علم و حکمت بخشتا ہے رقص جاں
ہاتھ آتے ہیں زمین و آسماں
فرد اس سے صاحبِ جذب کلیم
ملت اس سے وارث ملک عظیم
رقص جاں کا سیکھنا آساں نہیں
غیر حق سے ٹوٹنا آساں نہیں
حرص و غم سے پاک جب تک دل نہیں
رقص میں جاں آئے یہ ممکن نہیں
ضعف ایماں کا ہے، دلگیری ہے غم
اے جواں سن! ''نیمۂ پیری ہے غم''

(جاوید نامہ، اردو ترجمہ ایضاً)

اقبال نے اپنی مہم کا خاتمہ اس دین اور آئین کی نشاندہی کے ساتھ کیا ہے جس کی تفسیر اور تکمیل رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔ اسی لازوال نقش کے ساتھ جاوید نامہ بھی اپنے اختتام کو پہنچا ہے دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے انسانی تاریخ کے مسئلوں کا حل اور دکھوں سے نجات کا راستہ بھی دراصل تاریخ ہی میں ڈھونڈا ہے۔ اسلامی فکر، اپنی مابعد الطبعیات کے باوجود، تاریخ کے اجالے میں نہائی ہوئی ایک برگزیدہ زندگی (حیات طیبہ) سے ماخوذ ہے۔ یہی زندگی اس کا مقصد و محور ہے اور انسانی تاریخ کی سب سے بڑی شہادت۔ اقبال ایک لمبے، پُر پیچ اور دشوار راستے سے گزرنے کے بعد یہاں پہنچے ہیں۔ جاوید نامہ اسی تفتیش اور تلاش کی روداد ہے۔ اس تلاش کے اپنے معنی بے شک اقبال نے نکالے ہیں لیکن اس کے مرکزی حوالے کا گواہ ایک زمانہ رہا ہے اور اس سلسلے میں کسی قیاس یا واہمے کی گنجایش نہیں ہے۔

☆☆☆

آزاد نظم کے پیرائے میں جاوید نامہ کا اردو ترجمہ جس کی بنیاد پر اس کتاب کا یہ جائزہ مرتب کیا گیا، پروفیسر سید سراج الدین مرحوم کی غیر معمولی کوشش و بصیرت کا نتیجہ ہے۔ سراج صاحب نے یہ ترجمہ ۲۷ رمئی ۲۰۰۳ء کو مکمل کیا تھا۔ اس کام پر انہوں نے کئی برس صرف کیے تھے۔ جاوید نامہ کے اس ترجمے سے پہلے اقبال پر ان کی کتاب ''مطالعۂ اقبال'' چند نئے زاویے'' شائع ہو چکی تھی ۔ ان کی یہ چھوٹی سی کتاب اپنی نکتہ رسی اور بصیرتوں کے لحاظ سے بہت گراں قدر ہے۔ انہوں نے اقبال کو کسی جانب داری اور جذباتیت کے بغیر، ادبی قدروں اور معیاروں کے مطابق دیکھا تھا۔

سراج صاحب بڑے ذی علم، ذہین، اور ادب، اسلامیات، فلسفے اور فنون سے غیر معمولی شغف رکھنے والے انسان تھے۔ بہت دنوں تک جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ رہے اور بہ حیثیت پروفیسر سبک دوش ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد پروفیسر آل احمد سرور کی دعوت پر وہ کچھ عرصے کے لیے کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ سے بہ طور وزیٹنگ پروفیسر وابستہ ہو گئے۔ تقریباً دس برس انہوں نے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علمی جریدے Islamic culture کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ اطالوی حکومت کی دعوت پر انہوں نے اٹلی جا کر اطالوی زبان بھی سیکھی تھی۔ اور ڈانٹے کی ''ڈوائن کامیڈی'' کا مطالعہ براہ راست اطالوی زبان میں کیا تھا۔ انہوں نے اقبال، فیض اور قلی قطب شاہ کے اشعار کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا اور جاوید نامہ سے پہلے ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا ترجمہ اردو آزاد نظم میں کر چکے تھے۔ ۱۹۹۳ء سے اپنے انتقال تک (۲۰۰۶ء) سراج صاحب اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے صدر بھی رہے۔ جاوید نامہ کے زیر نظر اردو ترجمے کی اشاعت، اقبال اکیڈمی کے موجود صدر محمد ظہیر الدین صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ ظہیر الدین صاحب، اکیڈمی کے نائب صدر ضیاء الدین نیّر صاحب اور ان کے رفقائے کار کی طرف سے اقبال کے ایک عاشق صادق اور اکیڈمی کے سابق صدر کو یہ عقیدت اور محبت کا خراج ہے۔

ترجمہ وہ بھی شاعری کا، ایک انتہائی صبر آزما، مشکل اور آزمائشی کام ہے۔ اس عمل کی افادیت اپنی جگہ کہ ترجمے کی وساطت سے بے شک، دو افراد، یا معاشروں، یا روایتوں، یا ثقافتوں

کے مابین ایک ذہنی اور تخلیقی تعلق استوار ہوتا ہے۔ اور تیزی سے سمٹتی ہوئی، اسی کے ساتھ ساتھ، نسلوں، قبیلوں، علاقوں، زبانوں، قومیتوں، معاشرتوں اور ثقافتوں میں منقسم دنیا کو ایک ہمہ گیر اور منظم رخ عطا کرنے کے لیے ترجمے کے عمل کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں کئی قباحتیں ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجایش نہیں، تاہم چند نکات کی نشان دہی ضروری ہے۔

میں ڈاکٹر سموئل جانسن کے اس قول میں یقین رکھتا ہوں کہ ادب کے تمام اسالیب اور اصناف میں شاعری ہی دراصل زبان کے تحفظ کی ضامن ہوتی ہے۔ اسی لیے شاعری کا ترجمہ بہت مشکل ہے، چہ جائے کہ پابندی یا منظوم ترجمہ۔ شاعری کے مفاہیم صرف اپنی تعمیر میں صرف ہونے والے لفظوں کے یا زبان کے پابند نہیں ہوتے۔ بحر و وزن، آہنگ و اصوات، متعلقہ زبان اور متعلقہ شاعر کے مخصوص ذخیرۂ الفاظ، اس کے علامتی اور استعاراتی نظام میں بھی معنی کے بہت سے مضمرات چھپے ہوتے ہیں۔ ان سب کو ترجمے کے ذریعے، دوسری زبان میں منتقل کرنا کارِ محال ہے۔ شاید ناممکن بھی ہے۔ سراج صاحب کی خوش مذاقی اور ادب فہمی کا یہ امتیاز بہت اہم ہے کہ انہوں نے اقبال کے اردو میں منظوم ترجمے کی جگہ اس نظم کو آزاد نظم کے پیرایے میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں خیالات کو نظم کرنے کی صلاحیت بھی تھی، بحر اور وزن کی پابندی کے ساتھ۔ اور بے شک، فارسی اور اردو زبان کے باطنی رابطوں اور ان دونوں زبانوں کے مزاج میں ہم آہنگی کے جو پہلو نکلتے ہیں، ان کے پیش نظر سراج صاحب پابند اور روایتی نظم کا اسلوب بھی آزما سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے آزاد نظم کا پیرایہ اپنے ترجمے کے لیے اختیار کیا۔ اور یہ انتخاب انہوں نے جاوید نامہ کے بعض منظوم تراجم کو دیکھنے کے بعد کیا۔ مضطر مجاز کے ترجمے کا ذکر انہوں نے اپنے پیش لفظ میں خاص طور پر کیا ہے۔ فکری شاعری کے اپنے کچھ خاص اوصاف ہوتے ہیں لیکن شعر پڑھنے والے کی توجہ اور ذہنی تگ و دو، بڑے سے بڑے شاعر کے مطالعے میں بھی صرف اس کے افکار عقائد اور ذہنی سروکاروں کی تفہیم تک محدود نہیں رہتی شعر کا مطالعہ نہ تو صرف شاعری کے مغز کا مطالعہ ہے نہ صرف پوست کا۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کے مغز کو اس کے پوست سے الگ کرنا یا انہیں دو الگ الگ سچائیوں کے طور پر دیکھنے کا تصور بھی بے معنی ہے۔ شاعری میں لفظ بجائے خود معنی ہے۔ ہم غالب، میر کے خیالوں کو ان ہی کے مرتب کردہ لفظوں کے ساتھ یاد رکھنے

کی جستجو کرتے ہیں۔ شاعری میں زبان کے تحفظ کا مدعا اور مطلب یہی ہے۔ پابند نظم کے پیرایے میں کسی شعر یا نظم کو منتقل کرنے کا مطلب ہے اپنے کمال شعر گوئی اور ہنر مندی میں اور ہدف بننے والے شعر یا نظم میں مناسبت اور مفاہمت کی تلاش کرنا یا بہ ظاہر دو چیزوں کو ایک کرنا، اس طرح کہ انہیں دوبارہ الگ نہ کیا جا سکے۔ گویا کہ اصل شاعر اور اس کا مترجم، دونوں ایک سطح پر آجاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نقصان اصل شعر اور اس کے ترجمے دونوں کو پہنچتا ہے اور اس سے سب سے زیادہ زک ترجمے کی غرض سے اور یجنل شعر پڑھنے والے کے رویے کو پہنچتی ہے۔ مترجم چاہے ہے یا نہ چاہے، ترجمے کے عمل کے دوران کبھی دانستہ کبھی نادانستہ طور پر، طالب علمانہ انکسار اور عاجزی کے اس رویے سے محروم ہی ہو جاتا ہے جس کا ہونا ہر طرح کے ادبی مطالعے کے دوران ضروری ہے۔ کچھ ترجمہ کاروں کو میں نے اور یجنل شعر کہنے والوں سے زیادہ مدمَغ، مغرور اور خوش گمان دیکھا ہے۔ خود اقبال نے بھی گرچہ مشرق و مغرب کے کچھ شاعروں کو اردو نظم میں منتقل کیا ہے، لیکن منظوم ترجمے کی افادیت کے وہ زیادہ قائل نہ تھے اور علی گڑھ کے ایک فلسفے کے استاد کو، اسرار و رموز کے منظوم اردو ترجمے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ''انوار اقبال'' میں ان کا متعلقہ مکتوب موجود ہے۔

آزاد نظم کی ہیئت، بہر حال پابند نظم کے مقابلے میں بہت کشادہ، بہت کھلی ہوئی اور اظہار و بیان کے خطرے مول لینے کے لیے نسبتاً بہت زیادہ سازگار ہے۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی تک نے، ہر چند کہ خود تو ایسا کوئی تجربہ کرنے کی ہمت نہیں کی مگر وزن، قافیے اور ردیف کی قید سے رہائی کی حمایت اور وکالت کی تھی۔ اس وقت، ان باکمالوں کا دھیان بھی مغربی شاعری (خاص کر نیچریہ شاعری) کو اردو نظم میں ڈھالنے کی طرف تھا۔ نظم آزاد اور نظم معرا کا تقریباً اسی دور میں بتدریج مقبول ہوتے جانا، شاعری کے ترجمے کی بابت آزاد اور حالی کے موقف کی تائید کرتا ہے۔ ترجمے کی جس روایت کا جدید نظم کے تشکیلی دور میں آغاز ہوا، اس سے اردو شاعری کی ترقی بھی ہوئی اور اردو شاعروں پر اظہار و اسلوب کی ایک نئی دنیا کا دروازہ بھی کھلا۔

جاوید نامہ کی جیسی نظم یوں بھی آزاد نظم کے پیرایے میں منتقلی کیلیے شاید زیادہ موزوں تھی۔ سراج صاحب جاوید نامہ کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا ترجمہ کر چکے تھے اور ہر چند

کہ ویسٹ لینڈ اور جاوید نامہ کی فکری اور تخلیقی کائنات ایک دوسرے سے الگ ہے لیکن تہذیبی علائم، ثقافتوں اور تصورات کے مجموعی نظام میں گہرے فرق اور اختلاف کے باوجود، ایلیٹ اور اقبال کے سروکار باہمی قربت اور مماثلت کے کچھ پہلو بھی رکھتے ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر بیسویں صدی کے انسان کی روح، اجتماعی صورت حال اور نئی پرانی قدروں کی باہمی پیکار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

سراج صاحب کے لیے جاوید نامہ کے مقابلے میں اپنے ترجمہ کاری کے عمل کی حیثیت یکسر ثانوی تھی۔ وہ اقبال کی عظمت کے ساتھ ساتھ اقبال کے تمام شعری اور نثری کارناموں میں جاوید نامہ کے امتیاز و اختصاص کا شعور بھی رکھتے تھے۔ انسانی تجربوں، افکار اور معنی و مفہوم کا جو بے کنار منظر یہ جاوید نامہ کے صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس کے کئی اجزا ایسے ہیں جہاں سراج صاحب ٹھٹکے ہوئے اور حیرت زدہ دکھائی دیتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اقبال کی واردات ان پر بھی گزر رہی ہے اور ترجمہ کرنے کے بجائے وہ اپنے ترجمے کو خلق کر رہے ہیں۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے بہ طور مثال، سراج صاحب کے ترجمے سے چند اقتباسات میں یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں:

دن کہ جو کرتا ہے روشن کاخ و کو
گردش ارضی سے ہے جس کا وجود
جس کا سارا قصہ بس اک رفت و بود
میں نے دیکھا ہے اسے
لیکن اک دن اور جو ہے ماورا ایام سے
صبح جس کی ناشنا سا شام سے
نور اس کا جاں میں در آئے اگر
تفرقہ مٹ جائے رنگ و صوت کا
غیب اس کی روشنی میں ہے حضور
اس کا دوراں بے حدود و بے مرور
کر وہ راز اجاوداں مجھ کو عطا

تو اے خدا
کر دے اس بے سوز صبح و شام سے
مجھ کو رہا

.....

عہد حاضر تو خرد کا ہے اسیر
جو تڑپ میری ہے وہ اس میں کہاں
مدتوں اپنے میں پیچ و تاب کھاتا ہے وجود
تب ابھرتی ہے کوئی بیتاب جاں
گر برا مانے نہ تو، تو یہ کہوں
تخم تمنا کے لیے تیری زمیں
موزوں نہیں
بس غنیمت ہے کہ اس مٹی سے کوئی دل اُگے

.....

تو تو ہر جا، ہر زماں موجود ہے
یا تو ان اسرار سے پردہ اٹھا
یا یہ میری جانِ بے دیدار
مجھ سے چھین لے

(مناجات۔ص ۲/۳/۴/۵)

خاک یہ ہوگی فرشتوں سے بھی افزوں
ایک دن
اس کے دم سے ہوگی دھرتی مثل گردوں
ایک دن
فکر انسانی حوادث میں ہے جس کی پرورش
چرخ کے گرداب سے ہوگی یہ بیروں

ایک دن
پوچھتا کیا ہے تو مجھ سے معنی آدم کو دیکھ
جو پریشاں آج ہے، ہوگا وہ موزوں
ایک دن
ایسا موزوں ہوگا یہ افتادہ مضموں
ایک دن
جس سے ہوگا خود دل یزداں بھی پُرخوں
ایک دن
(تمہید آسمانی۔فرشتوں کا گیت۔ص ۱۳/۱۴)

ایک جوگی پیڑ کے نیچے تھا واں بیٹھا ہوا
آنکھ روشن، بال سر اوپر بندھے، عریاں بدن
گرد سانپ اک حلقہ زن
آدمی اک بے نیاز آب وگل
عالم اس کے واسطے اک پیکر اس کے دھیان کا
وقت آزاد اس کا صبح وشام سے،
گردش ایام سے
تھی غرض اس کو نہ کوئی
چرخ نیلی فام سے
آنکھ اٹھائی اور رومی سے کہا
''ہے کون تیرے ساتھ یہ؟
آرزوئے زندگی پیدا ہے اس کی آنکھ سے؟
(فلک قمر..... عارف ہندی جہاں دوست سے ملاقات ص ۳۸/۳۹)

ہے محمدؐ سے مرا دل داغ داغ
کعبے کا گل کر دیا اس نے چراغ

وہ خدا جو تھے ہمارے، اُن کے ساتھ
جانتے ہیں سب کہ کیا اُس نے کیا
دین آبا کی الٹ ڈالی بساط
توڑ ڈالے ضرب سے لات ومنات
اس سے کچھ لے انتقام اے کائنات!
اس نے غائب کو چنا حاضر کو چھوڑ
نقش حاضر کا فسوں اس نے دیا ایک دم میں توڑ
جس کی کوئی سمت نے کوئی نشاں
ایسا خدا،
کیا بھلا اس کی عبادت میں مزا
(..... طاسینِ محمدؐ، کعبے میں ابوجہل کی روح کا نوحہ ص ۶۱/ ۶۲)

دلبری دراصل مظلومی ہے
محرومی ہے عورت کے لیے
گیسوؤں میں اپنے کنگھی پھیر کر
کر کے سنگھار
ہم سمجھتے ہیں کہ مردوں کو کیا
ہم نے شکار
مرد لیکن صید بھی ہو جائے تو
صیاد ہے
گو بہ ظاہر ہے اسیر اپنا مگر
آزاد ہے
(مریخ کی نبیّہ کا پیغام، ص ۱۳۹)

سراج صاحب کا ترجمہ کہیں کہیں پابند ہو گیا ہے، کہیں اندرونی قوافی کے استعمال سے انہوں نے ایک خاص آہنگ وضع کرنے کی جستجو کی ہے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ جہاں بات کسی

اور طرح بن نہ سکے انہوں نے نثری ترجمے کو ہر اسلوب پر ترجیح دی ہے مثلاً غالب کی مشہور غزل ''بیا کہ قاعدۂ آسماں بہ گردانیم'' کا یہ ترجمہ دیکھیے:

آؤ کہ آسمان کا محور بدل دیں اور گردش جام سے تقدیر (کی گردش)
پلٹ دیں
کوتوال شہر بھی اگر زبردستی پر اترے تو پروانہ کریں
اور اگر شاہ وقت بھی تحفہ بھیجے تو قبول نہ کریں
اگر کلیم بھی ہم کلام ہوں تو کوئی جواب نہ دیں
اور خلیل بھی مہمان بننا چاہیں تو ٹال جائیں
جنگ پر آجائیں تو گل چیں کو خالی ہاتھ باغ سے نکال دیں
اور اگر صلح کی بات ہو تو پھر پرواز کرتے پرندوں کو شاخساروں سے
آشیانوں کو لوٹا دیں
ہم تو حیدری ہیں، کیا عجب کہ اگر چاہیں
تو سورج کا رخ بھی مشرق کی طرف پھیر دیں!
(فلک مشتری، نوائے غالب ص ۱۴۷/۱۴۸)

غالب کے فارسی شعر کا منظوم ترجمہ کرنا، غالب کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی خراب کرنا ہے۔ بہ قول فراق، آپ غالب کی تقلید کریں تو غالب کا کچھ نہ بگڑے گا، مگر آپ کی شاعری چوپٹ ہو جائے گی۔ شاعری میں بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے جو ترجمے کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ شاعری اظہار کے دوسرے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم تک بس اس کے مفہوم کی ڈور پہنچ جاتی ہے۔

ترجمے کے اس پورے عمل میں سراج صاحب کی ذہانت، طاقت اظہار اور الفاظ و آہنگ کے انتخاب میں ان کی غیر معمولی سلیقہ مندی کا اظہار بہت جگہوں پر ہوا ہے۔ اکا دُکا مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ان کا ترجمہ اپنی عام سطح کو قائم نہ رکھ سکا اور کیفیت سے عاری ہو گیا ہے، بالخصوص کتاب کے اختتامیے میں جہاں اقبال کا خطاب نئی نسل سے ہے۔ اس کے بیشتر حصے میں شاعری پر موعظت اور نصیحت کی خشکی غالب آ گئی ہے۔ لیکن سراج صاحب کے ترجمے کا مجموعی تاثر جاوید

نامہ کے زیادہ تر ترجموں کی بہ نسبت بہت دیرپا، لطیف اور پُر تاثیر ہے۔ ''جاوید سے خطاب'' کے بہانے جب وہ نئی نسل سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں وہاں بھی روکھی سوکھی گفتگو پر شاعری کا جادو کہیں کہیں صاف جھلکتا ہے۔ یہ آخری اقتباس دیکھیے:

ہر کوئی اب
اپنی اپنی راہ پر ہے تیز گام
راہرو گم راہ و ناقہ بے زمام
صاحب قرآں ہے بے ذوق طلب
کچھ عجب یہ بات ہے بے حد عجب
گر خدا تجھ کو کرے صاحب نظر
آنے والے دور پر بھی غور کر
عقل بے باک اور دل ہے بے گداز
آنکھ ہے بے شرم اور غرق مجاز
علم و فن دین و سیاست، عقل و دل
سب گرفتار جہانِ آب و گل
ایشیا، جائے طلوع آفتاب
دیکھتا ہے دوسروں کو، خود سے کرتا ہے حجاب
اس کا دل خالی ہے ساکن روزگار
زندگی بے وارداتِ ذوق سیر
بادشاہوں اور ملاؤں کا صید
فکر بے دم، عقل و دیں ناموس، ننگ
سب اسیر حلقۂ دام فرنگ

میں نے عصر نو سے دو باتیں کہیں
بند دو کوزوں میں دو دریا کیے
ایک ہے پیچیدہ حرفِ نوک دار

جس کے ہوں قلب وخرد دونوں شکار
جس میں ہو تہہ داری طرزِ فرنگ
دوسرا اک نالۂ مستانہ
مثل نغمۂ پرسوز چنگ
اصل اس کی ذکر ہے اور اس کی فکر

چاہیے وارث بنے دونوں کا تو،
ہیں یہی دو بحر جن سے ہے مری یہ آب جو،

☆

ترجمے کے علاوہ کتاب کے شروع میں سراج صاحب کا جو بیس صفحی پیش لفظ شامل ہے اس سے اس ترجمے کے محرکات، اس کی نوعیت، اور سراج صاحب کے ذہن میں جاوید نامہ کے فکری سیاق اور پس منظر کی کچھ وضاحت بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے جاوید نامہ کے مآخذ اور بنیادی مواد کے بارے میں ڈاکٹر محمد ریاض (پروفیسر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) کی کتاب جاوید نامہ (ناشر اقبال اکیڈمی، پاکستان ۱۹۸۸ء) سے ماخوذ کچھ باتوں کے علاوہ اقبال اور ان کی اس شاہ کار نظم کے سلسلے میں کئی فکر انگیز حقائق کی نشاندہی کی ہے اور کئی اہم نکتے دریافت کیے ہیں۔ مثال کے طور پر معراج کے واقعے کی فکری تعبیر جس کا جوہر اقبال کے اس شعر میں سمٹ آیا ہے کہ:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اسی کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں میں معراج نامے کی روایت اور فکر رومی سے اقبال کے استفادے کی حقیقت پر بھی سراج صاحب نے عالمانہ انداز سے نظر ڈالی ہے۔ مثنوی مولانا روم کی طرح، جاوید نامہ بھی سراج صاحب کے نزدیک کسی محدود معنی میں اسلامی نظم نہیں ہے۔ اس ضمن میں سراج صاحب کے پیش لفظ سے مختصراً کچھ عبارتیں درج ہیں۔ یہ اقتباسات جاوید نامہ کے ایک تربیت یافتہ قاری کے علاوہ خود اقبال کی ایک خاص سطح تک ہمیں لے جاتے ہیں اور اقبال فہمی کا اعلا نمونہ ہیں:

''جاوید نامہ ایپک (epic) نہیں۔ نہ صرف ڈوائن کامیڈی بلکہ فردوسی کے شاہنامے سے بھی اس کی مشابہت نہیں۔ جاوید نامہ فی الحقیقت ایک فلسفیانہ اور بعض حصوں میں عارفانہ نظم ہے جس میں کچھ سیاسی عناصر شامل ہوگئے ہیں۔ ڈوائن کامیڈی ایک مخصوص مسیحی استعارے سے شروع ہوتی ہے۔''

جاوید نامہ کے محرکات میں وہ سوالات داخل ہیں جو زندہ رود (اقبال) کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے ہیں اور ان کے جوابات وہ ڈھونڈ رہا ہے۔ ''تمہید زمینی'' میں وہ رومی سے یہ پوچھتا ہے کہ موجود و ناموجود کیا ہیں اور محمود اور نامحمود کی کیا پہچان ہے۔

''جاوید نامہ کے بعض حصے خطیبانہ یا ناصحانہ ہیں۔ جہاں شعر کسی نکتے کو قاری تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے، وہیں کچھ اور حصے ہیں جنہیں ہم شاعرانہ اور عارفانہ کہہ سکتے ہیں اور جہاں اقبال کی شاعری زیادہ گہری اور دلنواز ہے۔ عجیب بات یہ ہیکہ ابوجہل کا نوحہ جو ایک طرح سے اسلام اور پیغمبر اسلام کا بالواسطہ اور یہ کہیے کہ معکوس تحسین نامہ ہے، اپنے آپ میں شاعری کا پرسوز اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ اسی طرح ہوا ہے جس طرح ''پیراڈائز لاسٹ'' میں شیطان ایک زبردست ایپک کردار بن کر ابھرا ہے۔''

''اپنے پرانے دین کی تباہی پر یہ نوحہ ابوجہل کے دکھ کا مظہر ہے۔ وہ انسانی دکھ جو ہر قدیم اور عزیز روایت کے ٹوٹنے پر آدمی کو ہوتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ (ابوجہل کا) یہ نوحہ جاوید نامہ کے ان حصوں میں سے ایک ہے جو شاعری کی نسبت سے ممتاز ہیں۔ اس نوحے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے ابوجہل کے دکھ کو محسوس کیا ہے کیونکہ یہ ایک ہمہ گیر انسانی دکھ ہے۔''

''پیام مشرق میں جو نظم تنہائی کے عنوان سے ملتی ہے اس میں اقبال جاوید نامہ کی مناجات کی تنہائی سے زیادہ قریب ہیں۔ پیام مشرق میں وہ سمندر اور کہسار سے گزر کر چاند تک پہنچتے ہیں اور یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ان مظاہر کے اندر بھی کوئی دل ہے اور ان کی منزل کیا ہے۔ ..... جواب میں انہیں صرف ایک الوہی تبسم ملتا ہے۔ جاوید نامہ کی

''مناجات میں اسی کائناتی تنہائی کا ذکر ہے۔''

آسماں پر گو ہے تاروں کا ہجوم/ پر ہے ہر تارہ جدا/اور ہماری ہی طرح بیچارہ ہے
/وسعت افلاک میں آوارہ ہے۔'' جاوید نامہ میں تنہائی کی تخلیقی قوت غار حرا کی خلوت تک پہنچتی ہے۔ اسی خلوت سے نبی کریمؐ نے ایک نئی ملت کو وجود عطا کیا تھا۔'' ملتے از خلوتش انگیخت''

یہ وہ تنہائی ہے جس میں وجدان جاگتا۔ شعر نازل ہوتے ہیں اور آیات الٰہی کا جبرئیلی انکشاف واقع ہوتا ہے۔ غالب نے اسے نوائے سروش کہا تھا''

گویا کہ سراج صاحب نے جاوید نامہ کو دراصل بیسویں صدی کی دنیا اور اس کے زندہ مسئلوں کی روشنی میں ایک ایسی تخلیقی دستاویز کے طور پر دیکھا تھا جو ایک مرتب اور منظم فکر کی تابع تھی۔ اور اس صدی میں سانس لینے والی ایک حساس روح کے ردعمل اور اکتسابات کی مرقع ۔ جاوید نامہ کی فلسفیانہ بنیادوں پر سراج صاحب نے تفصیل سے نہیں لکھا۔ لیکن اس نظم کو اساس مہیا کرنے والے تصورات کی نشاندہی انہوں نے بڑے مدلل انداز میں کی ہے۔ انہوں نے دانتے، ملٹن، اور اقبال کے انفرادی اوصاف کی وضاحت بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے اور ایک بین اقوامی ادبی سیاق میں جاوید نامہ کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔ جاوید نامہ اقبال کی ایک طویل فکری ریاضت کے ساتھ ساتھ خود سراج صاحب کی گہری اور تربیت یافتہ سوچ اور ایک نکتہ رس، اسی کے ساتھ ساتھ فنی مذاق سے بہرہ ور ذہن کا عکاس بھی ہے۔ اس ترجمے کے ساتھ سراج صاحب کے اس فکری دائرے کی تکمیل بھی ہوتی ہے جو بیسویں صدی کے فکری مزاج کا احاطہ کرتا ہے، اور جس کی تعبیر کا سلسلہ انہوں نے ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کے ترجمے سے شروع کیا تھا۔ یہ ایک خرابے سے دوسرے خرابے تک کا سفر ہے جن میں زمان و مکاں تو مشترک ہیں، لیکن دونوں کی سمتیں اور منزلیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر عبدالحق
سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی

اقبال ایشیائی بیداری کا شاعر

مطالعۂ اقبال کی مختلف اور متنوع تعبیریں ہمیں سرشار کرتی ہیں اور ہماری حیرتوں میں اضافے کا موجب بھی بنتی ہیں۔ ہم اپنی سہولتوں اور سوچ کے مطابق اقبال کو زماں و مکاں میں رکھ کر تفہیم کو آسان بنا لیتے ہیں۔ اقبال بھی کئی استفہامیہ کا سبب بنتے ہیں۔ وہ کبھی شاعر مشرق اور کبھی شاعر فردا پر اصرار کرتے ہیں وہ نغمہ سرایان ہند ہیں مگر آہنگِ حجازی کی ترجمانی کرتے ہیں وہ خیابانِ کشمیر کے پروردہ ہیں۔ مگر روئے زمین کے کسی حصے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہماری نظر ایشیا تک گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان حدود سے آزاد ہیں۔ امروز فردا یا ایشیا بلکہ اس خاکداں سے کنارا کشی کا وہ اعلان بھی کرتے ہیں۔ حوروں و فرشتوں کو اسیر کرتے ہیں۔

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اس مستعار دنیائے دوں سے بھی آگے جہانِ قدس پر کمندیں ڈالتے ہیں وہ اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتے نوائے شوق سے حریم ذات میں پُرشور قیامت برپا کرتے ہیں یہاں بھی استقرار حاصل نہیں ہوتا تو جہانِ ممکنات یا عالم نو، جو ابھی پردۂ وجود میں ہے اس کی تعمیر اور ترجمانی کا ساز و سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس کہن سال معمورۂ دنیا کو خاکستر بنا دینے اور اہل نظر کو نئی بستیاں آباد کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ خالق کون و مکاں سے ایک دوسری دنیا طلب کرتے ہیں۔

جہاں وہ چاہئے کہ ہو ابھی نو خیز

غرض ان کی وسعت طلبی آفاق و امکان کی طرح بے پایاں ہے۔ مردِ آزاد کے وجود میں آفاق اپنی تمام پنہائیوں کے ساتھ گم ہے۔

سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

اس حرفِ راز کے اظہار کے لیے نفس جبرئیل طلب کرتے ہیں۔ ہم انہیں ایشیا کی بیداری کا بانگِ رحیل سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی پہلی فکری تخلیق کے ابتدائیہ میں اصرار کر کے اپنا تعارف اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی فکر کے ہر ثانیے میں سینکڑوں سورج طلوعِ فردا کے منتظر ہیں اور عالم ایجاد میں نمود کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ ''عالم نازاد'' سے نسبت رکھتے ہیں۔

ذرہ ام مہرِ منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از نازاد ہائے عالم است

اقبال کو کئی ناموں سے یاد کیا گیا ہم نے اقبال کی بے کراں بصیرت سے چشم پوشی کی۔ یہ نہ جانا کہ اقبال کی فکر و نظر پردۂ وجود کو چیر کر تقدیر عالم کو بے حجاب دیکھتی ہے۔ ان کی دروں بینی کائنات کے ماہ و سال کی تقویم ساز قوت رکھتی ہے اور وہ ارض و سما کی پراسرار کیفیات کی راز دار ہی نہیں نگہداری بھی کرتی ہے۔ وہ زمان و مکان کے طلسم کو خاطر میں نہیں لاتی۔ سو سال گزرنے کے باوجود ان کی مقبولیت اور معنویت میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے اشعار و اقوال آج بھی ہمارے ذہنوں کی تازگی میں معاون ہیں۔ عالم ناپید سے عالم آب و خاک کی طرف مراجعت کر کے یہاں کی پستی و پس ماندگی کے خلاف وہ روئے زمین کے تمام باشندوں کو خطاب کرتے ہیں۔ اس عمومی آواز میں کسی تفریق کو دخل نہیں ہے۔ انقلابی آواز کے مخاطب تمام انسان اور سبھی آفاقی جہات ہیں۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

عظمتوں کی مالک دنیا کی سب سے بڑی آبادی اور سب سے بڑے براعظم کی زبوں حالی نے اقبال کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ مسلم ممالک کا سب سے عظیم گہوارۂ تمدن بھی ہے۔ یہی سرزمین ان کے دین و دانش کی امین اور جولاں گاہ رہی ہے۔ اسلامی آثار و امصار کے لافانی

نقوش یہیں موجود ہیں۔ یہاں کے بیشتر ممالک مغرب کی غلامی پر مجبور ہیں۔ یہ براعظم ہر طرح کے سیاسی و معاشی استحصال کا شکار ہے۔ مغربی مدنیت نے جغرافیائی یا رنگ و نسل کے امتیاز سے ہمسایہ ملکوں میں خوں ریز جنگ جاری کی ہے۔ دین مسیحی کی تبلیغ کے نام پر جبری تبدیلیٔ مذہب کی مذموم کوشش سے بھی یہ زمین کشاکش سے دوچار تھی۔ مغرب کی غاصبانہ عیاری کے پردوں میں تہذیبی آویزش، عداوت کا باعث بن چکی تھی۔ اقبال کا مخاطب اول ایشیا انہیں اسباب سے ان کی فکر و نظر میں مرکزی توجہ کا طالب ہوا۔ ان کی خاور شناسی ان کے جذب و یقین سے ہم آہنگ ہے۔

گفت مردے شاعرے از خاورست
فکر اُو باریک و جانش درد مند
شاعرے یا ساحرے از خاور است
شعرِ او در خاوراں سوزے فگند

(جاوید نامہ)

نکتہ سنج خاوراں ہندی فقیر (مسافر)

اقبال کی شاعری کے دو ایسے منفرد پہلو ہیں جس کی نظیر عالمی ادب میں شاید ہی ملے۔ ان کا کلام عصری واقعات اور حادثات کا جام جہاں نما ہے جس میں رنج و راحت کے کئی پہلو بہت نمایاں ہیں۔ دوسری انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو شعر و تخلیق کو عالمی معاملات و مسائل کی آگہی بخشی۔ اردو آفاقی وسعتوں سے ہم کنار ہوئی۔ جب کہ ملک کے دوسرے ادب محدود تصورات میں پابند زنجیر رہے ان کی تخلیقات میں تیرہ سو سے زائد آثار و اسما و اماکن کے حوالے ہیں۔ ایشیائی ملک و ملت کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک کے نام بھی کلام میں موجود ہیں۔ جیسے امریکہ، اندلس، انگلستان، جاپان، جرمنی، فرانس، مصر، ولایت، ہسپانیہ، یورپ، یونان وغیرہ کے ساتھ متعدد شہروں و مقامات کے نام درج ہیں۔ ان ملکوں اور شہروں کی تاریخ و تحریک نیز عصری کوائف پر اقبال کی نظر ہمیں حیرت میں مبتلا کرتی ہے۔ ان کے بیانات کا یہ عالمی منظر نامہ بھی ان کی بصیرت کے یقین کے لیے کافی ہے۔ یہ ان کی وسعت نظر ہے کہ وہ پوری کائنات سے سروکار رکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے قلب و نظر کو اس براعظم سے جو شیفتگی ہے وہ کسی دوسرے خطہ ارض سے نہیں ہے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ اقبال اور ان کے اسلاف کا مسکن و مدفن ہونے کے

ساتھ ان کی تاریخ وتہذیب کا عروج وزوال بھی اسی خاک وخمیر سے وابستہ رہا ہے۔ ان کے سوز و ساز میں یہ ایشیا ہے جو روح جان وتن ہے۔

سوز وساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شراب وہم ایاغ از آسیاست

پس چہ باید کرد میں جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آسیا آں مرز و بومِ آفتاب
غیر بیں از خویشتن اندر حجاب

نظم ''بلالؓ'' میں اقبال ایشیا کی عظمت کا صدق دل سے اعتراف کر چکے تھے۔

جولانگہِ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند اس کا مقام تھا

انہیں یورپ کے ہاتھوں ایشیا کا ستحصال برداشت نہیں۔ انگریز تاجرانہ عیاری سے تخت و تاج کے مالک بن گئے۔ انہوں نے کشتِ دہقاں کے ساتھ دست کاری کے نایاب فن کو بھی تاراج کیا ہے۔

تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع از شاہی خراج
قالی از ابریشم تو ساختند
باز اورا پیش تو انداختند

یورپ میں تین سال کے مختصر قیام نے ایک نئی آگہی بخشی تھی ساتھ ہی مشرقی اقوام کے خلاف مغربی فکر وفسوں کی عیاری کے دل خراش مشاہدات سے بھی اقبال متنفر ہوئے تھے، ہندوستانی ادبیات میں یورپ کے خلاف اقبال کا یہ پہلا اعلانیہ تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

مغربی تہذیب ایشیائی اقدار کو قتل کرنے کے لیے خنجر بدست تھی اقبال نے پرزور لفظوں میں آگاہ کیا تھا کہ خود انہیں کے اسلحوں سے مغرب میں قتل عام برپا ہوگا۔ جنگِ عظیم اول اور انقلابِ روس نے اس پیشین گوئی کو پورا کر کے دکھا دیا۔ اس خون خرابے سے ایشیا محفوظ نہ تھا۔

ایران کی شمالی سرحدوں پر روس کا جارحانہ قبضہ ہو چکا تھا۔ یونان، اٹلی، برطانیہ اور فرانس افروایشیا کے بڑے حصے کو غصب کر چکے تھے۔ ترکی کا مردِ بیمار بھی جاں بلب تھا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ء کے درمیان نظام عالم دگرگوں ہو رہا تھا۔ اقبال کو تشویشناک صورتِ حال کا اندازہ ہو چکا تھا۔

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش

انقلاب روس سے ایک آس بندھی تھی کہ بوسیدہ نظام یورپ کے خلاف بطن گیتی سے نیا آفتاب طلوع ہوا ہے۔ اس انقلاب کو آفریں کہنے والے اقبال ہندوستانی ادبیات میں پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے اپنی بصیرت سے محکوم ایشیائی اقوام کے لیے اسے نوید صبح آزادی سمجھا۔ اقبال کی دروں بینی دیکھئے کہ 'خضر راہ'' لکھ کر سب سے پہلے استقبال ہی نہیں کیا بلکہ اسے ایشیا کے محکوم مزدوروں کے لیے خواجگی سے نجات کا ساماں قرار دیا۔ حالات ذرا بہتر ہوئے۔ قلبِ مسلماں کا اضطراب بھی قدرے تھم گیا تھا۔ اب طلوع اسلام کی آمد آمد سے اقبال کو ذرا اطمینان حاصل ہوا وہ مسلمانوں سے اقوام زمین ایشیا کی پاسبانی کا مطالبہ کرنے لگے۔ طلوع اسلام کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ نکتہ سر گذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہ اَطلس قبایانِ تتاری ہے

وسط ایشیا کے تاتاری نوجوانوں کی جانبازی و جاں سپاری سے اقبال کو بڑی امیدیں تھیں۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ ایشیا سے فرنگیوں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور ان کے عروج کا آفتاب بحر اوقیانوس میں غرق ہونے کو ہے کیونکہ ایشیائی باشندے بیدار ہی نہیں کفن بردوش ہو چکے ہیں۔ خداوندان مغرب کا ابلیسی نظام تار تار ہو چکا ہے۔

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

ایشیائی بیداری کو اقبال نے محسوس ہی نہیں کر لیا بلکہ اسے مہمیز بھی کیا۔ ضربِ کلیم میں یہ

اعتراف ملاحظہ ہو۔

عطا ہوا خس و خاشاکِ ایشیا مجھ کو
کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بے باکی

دوسرے اشعار بھی صورِ سرافیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رشکِ گردوں خاکِ پاک خاوراست (پس چہ باید کرد)
زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند
کسے نہ بود کہ ایں داستاں فروخواند

ان کا یہ احساس کسی عارف کے قول سے کم نہیں ہے۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تاخاکِ بخارا و سمرقند

'زبورِ عجم' کے دوسرے حصے کی اٹھارہویں اور انیسویں غزلیں تخلیقی اعجاز و اختراع کی حیثیت سے ادبی نوادرات میں شامل ہیں۔ انہیں غزل کہیں یا نظم ان میں ہیئت وموضوع اور اسلوبِ پیش کش کے سبھی انداز نرالے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر جو پیغام ہے وہ غلام اقوام کے لیے بیاضِ مسیحا کا نسخۂ شفا سے کم نہیں ہے۔ دو مصرع ملاحظہ ہوں:

از ہندوسمرقند و عراق و ہمداں خیز
باخرقہ وسجادہ وشمشیروسناں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
ازخوابِ گراں خیز

ایشیائی بیداری کے تعلق سے اگر صرف دو نظموں کو پیش نظر رکھیں تو احوالِ عالم بھی ہم پر آشکار ہو جائے گا۔ یہ دونوں نظمیں فکر اقبال میں کمال وقوسین کی طرح ہیں۔ خضر راہ اور طلوع اسلام، ساکنان اراضی کے استحصال اور خوش آیند دنوں کے استقبال سے عبارت ہیں۔ اقبال کے شعری اور فکری تصورات کی تفہیم میں دونوں تخلیقات کا سیاق وسباق ایشیا کی بیداری کا بانگِ درا بن گیا ہے۔ آتشِ نمرود میں اولادِ ابراہیم کی آزمایش ہے جس کے بعد خاکِ مشرق پر مثالِ آفتاب چمکنے اور بدخشاں و بخارا کو لعلِ گراں کی ارزانی بخشنے کی بات اقبال کی زبان سے بہت

اچھی لگتی ہے۔ ساتھ ہی نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ کی تحقیر اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی بات بھی اعلان جنگ سے کم نہیں ہے۔ یہ شعر آپ کی یادداشت میں محفوظ ہے:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

چند برسوں بعد اقبال کو محسوس ہونے لگا کہ اشتراکیت آمریت کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ دس سال پہلے جس اشتراکی نظام کو اقبال نے لبیک کہا تھا وہ سراب ثابت ہوا۔ اس اندوہ ناک صورت کو سامنے رکھ کر اقبال نے آگاہ کیا تھا۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو تو کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

نصف صدی بعد اشتراکی شیرازہ بکھر گیا۔ اور عالمی طاقت کا توازن بھی تبدیل ہوگیا۔ یہ ایشیائی بیداری کا دوسرا دور تھا۔ جسے اقبال نے قبل از وقت محسوس کرلیا تھا۔ وسط ایشیا کے باشندوں کی تقدیر شکن قوت نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس پس منظر میں اقبال کے اس شعر کو دیکھئے۔

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

روس کی حکمرانی میں مجبور مسلمانوں کی بدحالی سے اقبال مایوس تھے۔ یہ ان کی بصیرت تھی انہوں نے روس کے دوسرے انقلاب کو چشم دل سے دیکھ لیا تھا۔ یہ اشعار اسی عرفانِ نظر کے مظہر ہیں۔

اگر محصور ہیں مردانِ تاتار
نہیں اللہ کی تقدیر محصور
خودی را سوز و تابے دیگرے دہ
جہاں را انقلاب دیگرے دہ

اس سے قبل اقبال سوز و تپش سے خالی سینۂ تاتار پر وحشت زدہ تھے۔

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد
یا مسلمان مرد یا قرآن بمرد

اقبال کا ولولۂ شوق انہیں حرکت وحرارت کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

سوئے آتش گامزن مثلِ خلیل

ان کا یہ پیغام رنگ لایا اور سیاسی پردۂ وجود پر ایک دوسرا سورج طلوع ہوا۔ وسط ایشیا کی بیداری نے نئی انگڑائی لی۔ تاتاریوں کی گردش تیز تر ہوگئی۔ اقبال کی دوسری خواہش بھی پوری ہونے کو ہے۔

تا دمد صبحِ حجاز از شامِ کُرد

تقدیر جہاں کے یہ اسرار تھے جسے قلندر نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ ہماری فکرِ نارسا ان راز ہائے گیتی کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ مگر اقبال کی آگاہی میں کوئی کمی نہ تھی۔ یہ محض شاعرانہ اظہار نہ تھا۔ انہوں نے خاک نشینوں کو راز لوندی کے گر سکھائے۔

بنتے ہیں مری کار گہِ فکر میں انجم

اقبال جس وجدانی نظر کے مالک تھے اس کے انکشاف کے لیے کسی مرد غیب کا انتظار ہے۔ ہماری تنقید وتحلیل اقبال کی دریابی کے لیے ابھی تک دستک بھی نہیں دے سکی ہے۔

بحر قلزم کے ساحلی ممالک ایک نئی چنگیزیت سے دوچار تھے۔ یورپ کی چھوٹی سے چھوٹی ریاست بھی قہر باری میں پیشوائی کر رہی تھی۔ آس پاس کے مسلم علاقے ہدف بنے ہوئے تھے۔ یونان اور اطالیہ کی پشت پر بڑی جابر طاقتیں تعاون میں سرگرم تھیں۔ ہمسایہ ملک ترکی ہر طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھا مگر اماں کے لیے اور نبرد آزما بھی تھا۔ عثمانی خلافت کا تار و پود بکھر چکا تھا۔

خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اقتدار سے زیادہ فرنگی سیاست نے یورپی تہذیب مسلط کرنے کی حکمت تیار کی اور ترکی کی سرزمین خون سے لالہ زار تو تھی ہی، تہذیبی یلغار کے سامنے سپر انداز ہوگئی۔ رہی سہی کسر مصطفیٰ کمال پاشا نے پوری کر دی۔ خلافت کے زوال پر اقبال کو امید تھی۔ طلوع اسلام میں اقبال نے ترکوں کے مستقبل کی تاریخ مرتب کی ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

بند کے آخری شعر کی بشارت اور بلاغت دعوتِ فکر دیتی رہے گی۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

نئے نظام کے ساتھ نئی فکر بھی افرنگ کی ہم آغوشی کے آداب لے کر نمودار ہوئی اقبال نے پرسوز لہجے میں آگاہ کیا تھا۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مصطفیٰ کمال پاشا کی تجدید پسندی اور شعائرِ اسلام سے بے نیازی اور رضا شاہ پہلوی کی مغرب زدگی نے نئے فتنوں کو جنم دیا اور دونوں کے عبرتناک انجام سے بھی اقبال باخبر تھے۔ ابدالی کی زبان سے سنئے:

آلِ عثمان در شکنج روزگار
مشرق و مغرب زخونش لالہ زار
ترک از خود رفتۂ دستِ فرنگ
زہرنوشیں خوردہ از دستِ فرنگ

ترکوں کا ساز نئے آہنگ سے خالی ہے۔ نئی مضرابی میں بھی فرنگیوں کی نوائے کہنہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کے قید و بند سے وہ آزاد نہیں ہیں بلکہ۔

ہنوز اندر طلسم اُو را اسیر است

ان نارسائیوں کے باوجود اقبال کے خروش احساس میں ترکوں کی تازگی اور توانائی کا تموج پردۂ تقدیر کو چاک کرنے کے لیے کافی تھا۔

نقاب از روئے تقدیرے کشاوند
بہ ترکاں بستہ دربارا کشاوند

وسط ایشیا کے دوسرے ممالک بھی رزمِ شر میں جبراً گرفتار کیے گئے تھے۔ فلسطینیوں کو ہجرت پر مجبور کر کے یہودیوں کو ان کی سرزمین میں بسایا جانا بیسویں صدی کا سب سے سنگین اور بہیمانہ حادثہ تھا۔ ایشیائی اقوام کی ایسی بے بسی تصور نہیں جا سکتی تھی۔ اقبال کا دل بھی شق ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اس حادثے سے بہت مایوس تھے۔

ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو

مغربیوں کی جنگ آزمائی سے پیدا شدہ شعلوں کی لپک سے عراق وایران محفوظ نہ تھے۔ اقبال نے چین کے ساحل سے تابہ خاک کاشغر بے سبب نہیں کہا تھا۔ گویا ایشیا مشرق سے مغرب تک مقتل بنا ہوا تھا۔ اقبال نے بڑی فکر انگیز بات کہی تھی۔ جو فلک عطارد سے مولانا جمال الدین افغانی کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔

مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب

یہ وہی مولانا ہیں جن سے اقبال نے بہت کچھ کسبِ فکر ونور کیا ہے۔ اقبال و جمال کی انقلابی فکر کے باہمی رشتوں میں جو ہم آمیزی ہے اس کا اعتراف کیا جانا ابھی باقی ہے۔ اقبال نے افغانستان کے حوالے سے جاوید نامہ میں سید کے مقام اور مقاصد پر انتہائی فکر انگیز خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ معترف ہیں کہ عالم مشرق نے دو جاں باز جیالے پیدا کئے۔ سید جمال اور حلیم پاشا۔ جنہوں نے عصر حاضر کے مسائل کی مشکل کشائی کی ہے ان کی آواز پر سنگ وسفال بھی لبیک کہہ کر گویا ہوئے ہیں۔

سید السادات مولانا جمال
زندہ از گفتارِ او سنگ وسفال

اقبال نے ایک خود آیند حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ جس کا سلسلہ شہادت اب تک جاری ہے۔ دنیا نے جنگ وقتل کی اتنی لمبی تاریخ نہیں دیکھی۔ جسے فلسطینی عوام انجام دے رہے ہیں۔

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

دوسری بات بھی بہ سلسلۂ عراق قابل توجہ ہے۔

بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق وعظام
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

تیسری بات بھی کم اہم نہیں ہے۔ جو طنز میں کہی گئی ہے۔

وفدِ ہندوستاں سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پئے ہضمِ فلسطین و عراق

یہ باتیں ۱۹۲۴ء کی ہیں جب ان ملکوں کی تاریخ کا تاریک دور حاوی تھا اس سے قبل 'رموز بے خودی' میں اقبال مایوسی کا اظہار کر چکے تھے۔

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل

اس طنز کو یوں ہی گردانا کم نگہی ہوگی۔ ذرا آج کے سیاق میں تفکر کے ساتھ توجہ دیں تو شاید اقبال کی بات آپ کے دل میں اتر سکے۔ چوتھی بات سب سے اہم ہے۔ اسے بھی پون صدی بعد بھرپور معنویت حاصل ہوئی ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ یہ سرزمین شہادتِ شبیریؓ کی منتظر ہے۔ اور خونِ حسینؓ کی طلب گار ہے۔

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شامِ خویش را (زبورِ عجم)

اس سرزمین کے جیالوں نے جو پیمان وفا استوار کیا تھا اس کی بدولت یہ خطۂ اراضی کشت وخون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ سوڈانی درویش کی زبان سے اقبال نے جاوید نامے میں حرمین شریفین کے محافظوں کو آگاہ کیا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی بصیرت آج کی صورتِ حال کو بے پردہ دیکھ رہی تھی۔ اور غیرت دلا رہی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۲۴ء میں امیر فیصل کو سنوسی نے جو پیغام دیا تھا اسے ذہن میں رکھیئے، کہ امیر صرف نام ونسب کا حجازی ہے دل سے نہ حجازی ہے اور نہ غازی۔ یہی شیخ حرم ہے جو گلیم بوذرؓ اور چادرِ زہراؓ کو بیچ کھاتا ہے۔

اے فواد اے فیصل اے ابن سعود
تا کجا برخویش پیچیدن چوں دود
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر
تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر

یعنی تو غیروں کی محتاجگی اور گداگری میں کب تک گرفتار رہے گا۔

اقبال نے امتِ عربیہ کے ضمیر کو للکارا تھا۔ انگریزوں کی فسوں ساز حکمتِ عملی سے باخبر رہنے کی تاکید کی تھی اور ان کے فریب سے بھی آگاہ کیا تھا۔ جس نے عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے نفاق کا زہر سرایت کر دیا ہے۔ مغربی فتنوں میں مستغرق قوم کو بیدار کرنا آسان نہ تھا۔

۱۹۲۳ء میں ہاشمیوں کے ہاتھوں ناموس دینِ مصطفیٰؐ کا سرِ بازار بکنا اقبال کو گوارا نہ تھا۔ ان کا یہ قول ضرب المثل بن گیا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ

کچھ برسوں بعد اقبال نے ان کے ضمیر کو آواز دی۔ جو مردہ و افسردہ ہو چکی تھی۔ جمال عبدالناصر نے عرب قومیت کی بنیاد فراعنہ مصر پر رکھی۔ یہ لکڑی کا گھر ثابت ہوئی۔ ان کی منتشر قوتیں منظم نہ ہو سکیں۔ درماندگی اور دریوزہ گری ہی شیخ و شہنشاہیت کی بختِ نارسا بن گئیں۔

اے زافسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد
از کفن دزداں چہ امید کشاد

اقبال نے عربوں کی لوحِ تقدیر کی تحریر بھی پڑھ لی تھی کہ قوت سے محروم قوموں کے مقدر میں ذلت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

رائے بے قوت ہمہ مکر وفسوں
یا۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس تلمیح کی معنویت اقبال نے منکشف کی ہے۔ جو کسی دوسرے موقع کی ہے۔ لیکن تیغ ایوبی کی تمثال اور تاکید کے مخاطب عرب ہی ہیں۔

تیغِ ایوبی نگاہ بایزید
گنج ہائے ہر دو عالم راکلید

عرب اقبال کے فیضانِ نظر سے محروم رہے۔ مغربی آقاؤں کی غلامی سے نجات حاصل نہ ہو سکی۔ تھوڑی جنبش پیدا ہوئی۔ شعرا اقبال کے تراجم اور مختلف تحریروں نے ایک تحریک پیدا کی۔ اخوان بڑے آب و تاب سے میدان میں اترے۔ سید قطب شہید کی قیادت، عوامی حقوق کی بحالی نے روشنی دکھائی۔ ۱۹۳۳ء میں طارق بن زیاد کی دعا مستجاب ہوئی۔

عزائم کو سینوں میں بیدار کردے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کردے

شروع شروع میں یعنی ۱۹۲۳ء تک وہ ایران کی سرد مہری سے شاکی تھے۔ کیوں ان کے دلوں میں تاب وتپش کی حرارت ناپید تھی۔

خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند

عراق وحجاز کی طرح اقبال کو ایران سے ایک گہری جذباتی وابستگی تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کا پیغام ایران میں پہنچ چکا ہے اور وہ برگ وبار لانے کو ہے۔

نوائے من بہ عجم آتش ِ کہن افروخت

اس سے بہتر اقرار بھی ملاحظہ ہو

عجم از نغمہ ام آتش بجان است

اس سے بھی بلند بات اقبال کے اعتراف میں موجود ہے۔

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
زِ سودایم متاع او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ دردشت
ز آواز درایم کارواں شد

وہ مزید اقرار کرتے ہیں کہ ایران میں ایک دوسری دنیائے جم کا ہنگامہ اقبال نے برپا کیا ہے۔ اقبال کو ایران کے نوجوانوں سے بڑی توقعات تھیں وہ ایک نئے دور کے انقلاب کا آغاز کریں گے اور دنیا کو آشتی اور خیر سگالی کا پیغام پہنچائیں گے۔

چوں چراغ ِ لالہ سوزم درخیابانے شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جان ِ شما

یہی نہیں اقبال نے جو فکر انگیز بات کہی تھی وہ کسی مفکر یا مدبر کی زبان پر نہ آسکی۔ اور نہ خیال میں پیدا ہوسکی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبال عالمی امن کی خاطر جینوا میں اقوام متحدہ کے قیام سے مطمئن نہ تھے۔ بلکہ کہا کرتے تھے کہ چند کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنائی ہے۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یہ اقوام کی انجمن ہے۔ یہاں وحدتِ آدم کی گنجایش نہیں ہے۔ اقبال کی نظر میں وحدت اقوام کا تصور مہلک نتائج کا حامل ہے۔ اس کی جگہ وحدتِ آدم کے لیے مجلس کا قیام ہونا چاہئے۔ اس مرکزی عالمی انجمن کے قیام کے لیے اقبال کی نظر میں جینوا نہیں تہران سب سے بہتر جگہ ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کرۂ ارض کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

تہران ہوگر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اقبال کی یہ بصیرت تھی جس کے مشاہدے میں ہم سب شریک ہیں۔ اور مقر بھی ہیں کہ اس سے بہتر صورت ممکن نہیں ہے کیونکہ اقوام متحدہ مغربیوں کی جنگ زرگری کا بدتر نمونہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے مشاہدے میں ہے کہ مولانا خمینی کے انقلاب کے زمانے میں شہروں اور شاہ راہوں پر جگہ جگہ بڑے بڑے تختوں پر اقبال کے انقلابی اشعار آویزاں تھے۔ جن میں روزن زنداں سے شعاعِ آزادی کی بشارتیں اقبال نے دی ہیں۔

کیا اس شعری قول اور الہامی آواز سے کوئی انکار کرسکتا ہے۔ مولانا خمینی کے انقلاب آہنگ کی پوری بازگشت محسوس کی جاسکتی ہے۔

مرد صحرائی بایراں جاں ومید
بازسوئے ریگ زارِ خود مید

افغانستان سے اقبال کو بڑا جذباتی تعلق خاطر تھا۔ اقبال نے جس جذب وشوق سے افغان اور اس کے متعلقات پر متوجہ ہیں وہ شاید کسی دوسرے ملک سے پیدا نہ ہوسکا۔ مردحر کے تصور میں مردِ کہستانی کو بڑا دخل ہے۔ اقبال کابل کو دہلی پر ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ دہلی محکوم وغلام ہے۔ جب کہ کابل انگریز حکمرانوں کی مداخلت سے آزاد ہے۔

کہ ایں زمیں زطلسمِ فرنگ آزادست

وہاں کے قبائل اور قبیلے کے نوجوانوں میں جاں بازی اور سرفروشی کی سرشاری مشرق و مغرب میں تلاطم پیدا کرسکتی ہے۔ افغانستان سے یہی محبت ہے کہ ان کی شاعری میں قبیلے،

کہستاں، کوہ، قلندر، کہسار، کبوتر، شہباز، لالہ، صحرا کے استعارے اور علامتیں بڑی معنویت رکھتی ہیں۔ خوشحال خاں کی وصیت کے دو اشعار پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اقبال کا پیغام بیداری خاص طور پر افغانستان سے کئی نوعیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ جمال الدین افغانی کی تحریک سے اقبال براہ راست متاثر تھے۔ ۱۹۳۳ء میں والی افغانستان کی دعوت پر اقبال کابل حاضر ہوئے انہوں نے اپنے ولولہ انگیز خیالات پیش کئے۔ مثنوی مسافر کے اشعار کی تروتازگی اور موثرات کو آپ ہم آج بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ بلکہ دیدۂ بینا ہو تو شفاف دیکھ بھی سکتے ہیں۔

ذکر وفکر نادری درخونِ تست
قاہری یا دلبری درخونِ تست
تازہ کن آئینِ صدیقؓ و عمرؓ
چوں صبا بر لالۂ صحرا گزر

ظاہر شاہ کو خطاب کرتے ہوئے اقبال نے دل کے سوز وساز کے ساتھ حکیمانہ بصیرتوں کا بھی اظہار کیا تھا وہ بصیرت جوان کے حواس وشعور کو اُست خیز کر رہی تھی۔ وادی وکہسار کی خوگر قوم کی پیشانی پر اقبال کچھ اور دیکھ رہے تھے۔ افغانیوں کے لیے نئے سوز وتپش کی دعا مانگ رہے تھے تاکہ ان کے لیے صبح نوروز کے امکانات روشن ہو جائیں۔ ان کی تقدیر کے اسرار سے اقبال آگاہ ہو چکے تھے۔ افغانی نوجوانوں کی نگاہیں شہباز وشاہین کی نظر سے بھی تیز تر ہو رہی تھیں۔ ملک و ملت کے مسائل پر نگہداری کی تاکید کرتے ہیں۔

اے نگاہِ تو زِ شاہیں تیز تر
گردِ ایں ملکِ خدا دادے نگر
باز تو گویم اے جوان سخت کوش

چیست فردا؟ دخترِ امروز و ودش
بازافغاں را ازاں سوزے بدہ
عصرِ اُو را صبح نو روزے بدہ

اورنادرآں دانائے رمزِ اتحاد کا انکشاف بھی کیا تھا۔

آں شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند وچین وروم و شام
نوبتِ اُو در دکن باقی ہنوز

ایک اور حقیقت بھی ملاحظہ ہو کہ افغان اقتدار کے سزاوار ہوں گے۔

مقتدی تاتار و افغانی امام

افغانستان سے اقبال کی عقیدت اور فکری تعلق نے وہ حرفِ راز بھی کہلوا دیا جو نزولِ بشارت سے قریب تر ہے۔ آج کے حالات کو ذہن میں رکھیں اور ان اشعار کے پس منظر کو بھی یاد رکھیں تو اقبال کا قول کسی مردِ خود آگاہ کی آوازِ درا سے کم نہیں ہے۔ جاوید نامہ میں ابدالی کی زبان سے حقیقت ابدی کا انکشاف بڑی معنویت کا حامل ہے۔

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملتِ افغاں دراں پیکر دل است
از فسادِ او فسادِ آسیا
در کشادِ او کشادِ آسیا

اتنی بلیغ اور نکتہ آفریں پیش گوئی اقبال کی زبان سے ہی ادا ہو سکتی تھی۔ آج پورا ایشیا جھلس رہا ہے۔ ایشیا ہی کیا افغانستان کی وجہ سے پورا عالم اندیشہ ہائے مرگ میں مبتلا ہے۔ عوام بہتر نظام کی آرزو کے لیے ہر امتحان سے نبرد آزما ہیں۔ یہ آواز

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
او غافل افغاں تو بھی اپنی خودی پہچان

اقبال کی دعا درگاہ حق میں مستجاب بھی ہوئی:

خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری

کشمیر سے اقبال کو جذباتی تعلق ہے۔ وہاں کی تحریکِ آزادی میں اقبال کے اقوال واشعار کو شروع سے ہی بڑا دخل رہا ہے۔ ان کی حیات میں ہی داعیانِ تحریک رہ نمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ مختصراً عرض کروں کہ اقبال کے اثرات نے نئی جنبش پیدا کی۔ انگریزی اقتدار کے زمانے میں ہر ظلم وزیادتی کے لیے اقبال برسرِ پیکار رہے اور بغیر کسی مایوسی اور ہزیمت کے۔ انہیں آتش چنار کی تمازت سے بڑی امیدیں تھیں۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

دوسرے اقوال بھی غور طلب ہیں۔

ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

یا

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

یہ خطۂ زمین اقبال کے موثرات سے کیوں کہ محروم رہ سکتا تھا۔ نتائج سامنے ہیں اس علاقے کی پستی اور محرومیوں سے اقبال خوب واقف تھے۔ وہاں کی رعایا پر راجا کے مظالم انگریز کی آمریت سے کم نہ تھے۔ اقبال نے تحریک آزادی کی تائید کی اور فکر وشعر اور مشوروں سے عوام کو متحرک کرتے رہے۔

جاوید نامہ میں شاہ ہمدان سے سنئے:

از غلامی جذبہ ہائے او بمرد
آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
کوہ ہائے خنگ سارِ اُو نگر
آتشیں دست چنارِ اُو نگر

مجلس اقوام کی کارکردگی اور فیصلوں پر نظر ڈالئے تو اقبال کے ارشادات کا یقین ہوگا۔ بڑی طاقتوں کی اجارہ داری نے پس ماندہ ملکوں کو خوار وزبوں کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی اور اب ایک طاغوتی طاقت کی حکمرانی نے اس ادارے کو بے گور وکفن لاشے کی طرح انسانوں کی بستی کو تعفن سے مسموم بنادیا ہے۔ سبھی اقوام بے دست وپا ہیں ایک نئے طرز کی استبدادی آمریت نے جنم لیا ہے۔ تاریخ عالم کی سراسیمگی کا اقبال کو بہت پہلے ادراک ہو چکا تھا۔ اگر یورپ کے ممالک کا اتحاد ممکن ہوسکتا ہے تو ایشیائی قوموں کا اجتماعی ارتکاز کیوں کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اقبال کی ایشیائی بیداری کا یہ سب سے صحت منداور دانشورانہ مشورہ تھا۔ جسے ہم محسوس نہ کر سکے۔ اور نہ قبول کر سکے۔ عملی اقدام تو دور کی بات ٹھہری۔ انجام کار ایشیا پر مغربی آمریت کی نئی حکمتِ عملی نافذ کردی گئی۔ جس کے خلاف ایشیائی عوام سرفروشی کے لیے میدان میں اتر پڑے ہیں۔ یہ جنوں خیز مظاہرے اور مجاہدے اسی سررشتہ بیداری کے سلسلے ہیں۔ اقبال نے ۱۹۳۱ء میں ہی سید جمال الدین افغانی کی زبان سے جغرافیائی حدود کو مسمار کرنے کی تنبیہ کی تھی۔ کیوں کہ یہ مغربی فسوں کا شاخسانہ ہے جو ایشیائی اتحاد کی راہ میں حائل ہے۔

او بفکرِ مرکز و تو درنفاق
بگذر از شام و فلسطین و عراق

ایشیاء کے مرکزی نظام کو اقبال شفاف نظروں سے دیکھ رہے تھے اور شدت سے محسوس کررہے تھے۔ وسط ایشیاء یعنی شمال ومغرب سے لے کر جنوبی مشرقی ایشیا کو ایک رشتہ و پیوند میں منسلک کرنا ان کے عزائم میں شامل تھا۔

شام وعراق و ہند وپارس خوبہ نبات کردہ اند
خوبہ نبات کردہ را تلخی آرزو بدہ

'ارمغانِ حجاز' پایانِ عمر کا حاصل ہے۔ جو ان کے انتقال ۱۹۳۸ء کے بعد شائع ہوا۔ کشمیر کے انقلاب آفریں کروٹ کو اقبال نے بہ چشم نم دیکھا تھا۔ اور آنے والے دور کے خواب کی تعبیر کا منظر بھی ان کے روبرو تھا۔ یہ شعر اسی تعبیر کی تفسیر بیان کررہا ہے۔

چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یک دانہ

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

اس علاقے سے ملی ہوئی سرحدوں کے مشرق چلئے اقصائے چینی نظر آئے گا۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ چین ایک دور دراز اور ہم مشربوں کا ملک نہ ہونے کے باوجود اقبال اس کی آزادی کے ہم نوا تھے۔ وہاں کے مکینوں کی لرزہ خیز انگڑائی کو لبیک کہتے رہے اور محسوس کرلیا تھا کہ اسے دیر سویر آزادی سے ہم کنار ہونا ہے۔ چنانچہ وہ بیداری کی بشارت دینے میں تمام ہندوستانیوں سے آگے تھے۔ یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ فکرِ اقبال میں چین کی بڑی معنویت ہے۔ ان کے افکار میں چین سے بڑی قربتوں کا برملا اظہار ہوتا رہا ہے۔ خواہ وہ ترانے ہوں یا تلمیحات تفکر ہو یا تحریر وتخلیق۔ زمانے کے حوادث نے ثابت کردیا کہ چین سے اقبال کی نسبت بے سبب نہ تھی۔ جب کبھی ایشیائی ممالک یا مکینوں کا ذکر ہوتا ہے تو چین سے گریز ناممکن ہے۔ بلکہ آغاز ہوتا ہے۔

چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

ہندی وچینی سفالِ جام است رومی وشامی گلِ اندام است
از حجاز وچین و ایرانیم ما شبنم یک صبحِ خندانیم ما
دیدہ ام امریک دہم ژاپون وچین بہر تحقیقِ فلزات ِ زمیں
باز تو گویم اے جوان سخت کوش چیست فردا؟ دخترِ امروز دودش
باز افغاں را ازاں سوزے بدہ عصرِ اُو را صبح نو روزے بدہ

فکری اظہار یا اکتساب بھی ملاحظہ ہو جو ایک تشریح طلب مسئلہ بنا ہوا ہے

کہہ گیا چینی حکیم اسرارِ فن

تیسرا رخ بھی توجہ چاہتا ہے۔ اقبال آزادیٔ چین کے نقیب بن کر نمودار ہوتے ہیں اور آنے والے دور کی تصویر دکھاتے ہیں۔ اکثر ان کی مستقبل شناسی ہماری حیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ہمیں ان کی شاعری کے پیغمبرانہ پہلوؤں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ساقی نامہ کا یہ شعر آزادی کے استقبال کا نغمۂ نوبہار ہے۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

ضربِ کلیم کا یہ شعر ملاحظہ ہو

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام، مکی خفتہ در بطحا

ایک اور بات جو سب سے زیادہ حیرت خیز ہے۔ آج عالمی منڈی میں چین کی مصنوعات کی فراوانی اور ارزانی سے بڑے سے بڑے مقتدر ملکوں کا معاشی نظام درہم برہم ہو رہا ہے ۔ پیرانِ خرابات تحفظ کی تدبیریں سوچنے پر مجبور ہیں۔ اقبال نے سینۂ کائنات کے اس راز کو بہت پہلے افشا کر دیا تھا۔

چیں رباید از بساطِ روزگار
ہر نگار از دستِ او گیرد عیار

اس موضوع سے ہٹ کر ذرا موجودہ سیاسی منظر نامے پر اقبال کی ۱۹۳۶ء کی خیال افروزی ملاحظہ ہو۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب یہودی نظام فکر و عمل کی صورت میں ہر محاذ پر حاوی ہوگا۔ سب سے پہلے عیسائی اس کی زد میں ہوں گے۔ کلیساؤں کے متولی یہود ہوں گے اور مقتدی عیسائی ہاتھ باندھ کر ان کی امامت قبول کریں گے۔

شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہودی میں ہے

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ آج دنیا کی سب سے بڑی جابر طاقت کی مہار دست یہود میں ہے۔ پورا نظامِ عالم درہم برہم ہو رہا ہے۔ اقبال نے ایشیائی بیداری کے لئے اس کے اتحاد کو ملزوم قرار دیا تھا ساحلِ چین سے بحر روم تک انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا تصور انہیں اکثر تڑپاتا رہا۔ یہ اضطراب کسی نہ کسی حد تک مؤثر ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ترکی، ایران اور پاکستان کے علاقائی تعاون کی تنظیم نے جنم لیا۔ مسلم ممالک اور تیل پیدا کرنے والے ممالک کے متحدہ اداروں کے قیام میں بیداری کی بازگشت سنی جا سکتی ہے۔ سارک ممالک کا اتحاد وجود میں آیا۔ بعد ازاں جنوب مشرق کے ممالک میں تعاون کی انجمن قائم ہوئی۔ روس نے اپنے حلیف ملکوں کی دولت مشترکہ قائم کی افرو ایشیائی ممالک کے باہمی اتحاد کی صورت بھی پیدا ہوئی۔

یہ ایک عمومی تذکرہ ہے۔ جس میں عہدِ اقبال کی سیاسی صورتِ حال اور اقبال کے فکری ردِ

عمل کے ساتھ ان کی پیامبرانہ شاعری پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔اقبال نے محکوم اقوام کے استحصال کے خلاف جس شدت سے نفرت کا اظہار کیا اور انہیں پیکارِ جنگ کے لئے آمادہ کیا۔اس کی مثال برصغیر یا براعظم ہی نہیں کرۂ ارض پیش کرنے سے قاصر رہی ہے،اقبال اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔وہ پیش گوئی کے قائل نہ تھے۔لیکن ان کی بصیرتوں میں وجدان والہام کے مشاہدات اور کرشمہ ساز فکر کسی طرح کم نہ تھی۔

مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب
بچا کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

اقبال نے اپنے جہاں آشوب نغمے کو لامکاں کے لئے سنبھال کر رکھا تھا نہوں نے اسے انتہائی دردمندی سے براعظم کی بیداری کے قافلے میں لٹا دیا۔ان کی ایشیائی بصیرت،انجم شناسی کو مات دے کر تاروں کی گردش تیز تر کر کے دلِ ہر ذرہ کو رست خیزی کے لئے سامان سرفراہم کر گئی۔فردائے قیامت تک بیداری بخشنے والی آوازیں اقبال سے ہی منسوب کی جائیں گی۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

☆☆☆

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
(سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی)

اقبال شناس مرد بیابانی۔ سید احمد ایثارؔ

انسان فطرتاً تجسس و تحقیق کا شائق ہے۔ محنت و کاوش، سعی و پیکار اس کی عادت ہے اور یہ جدوجہد خود اپنی جگہ ایک مقصد اور ایک قدر ہے اس لیے اس کے باحاصل یا بے حاصل ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا البتہ اس تگ و دو میں آرزوئے پیہم زندگی کو کیف و لذت سے ہمکنار کرتی ہے ہزار ہا آسودگیوں اور نا آسودگیوں کے باوجود تمنا انسان کی طبعیت کو سکون لینے نہیں دیتی غالبؔ نے اس لطیف نکتہ کو بڑے ہی دلنشین انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور یہ آرزومندی انسانی فکر و نظر کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے وہ بھی غالبؔ کی زبان سے سن لیجئے۔

شوق ہے ساماں طراز نازش ِ ارباب عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

یہ تمہیدی کلمات کی وجہ علت سبب کچھ اور نہیں آج ایک ایسے ہی بزرگ، شعر فہم، شعر گو اور مترجم کا ذکر مقصود ہے جس کے ذوق و شوق نے شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کے سرمایہ افتخار و ناز کلام کو اردو زبان میں منتقل کیا اور یہ شخصیت ہے سید احمد ایثار (بنگلوری) (فارسٹ ڈپارٹمنٹ (میسور) کے اعلیٰ عہدیدار) خوش قسمتی سے مجھے ان سے نیاز حاصل ہے بلکہ یہ موصوف کی محبت اور شفقت ہے کہ انہوں نے اپنے قطعات و رباعیات کے مجموعہ ''ترانہ و ترنگ'' کی تقریب اجراء میں یاد فرمایا اور تو اور ۲۰۰۳ء میں ''جاوید نامہ'' (ترجمہ) اور جناب اکمل آلدوری

کی کتاب ''جادۂ اخلاص'' (رباعیات کا انتخاب) کی رسم رونمائی وسیمینار ومشاعرہ میں بنگلور دعوت دی اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ محترم ظہیر الدین احمد (صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد) نے مجھ طالب علم سے خواہش کی کہ جناب سید احمد ایثارؔ مترجم اقبالؔ سے متعلق ایک مضمون لکھوں، یہ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ ابھی میں اس مضمون کے بارے میں غور وفکر ہی کی منزل میں تھا کہ بھائی ظہیر الدین احمد نے ایثار صاحب کی محکمہ جنگلات سے وابستگی کے ناطے اس کا ایک خوبصورت عنوان تجویز کیا ''اقبال شناس مرد بیابانی ۔سید احمد ایثار'' ظاہر ہے عنوان نے خیالات کو صفحہ قرطاس پر لانے پر آمادہ کیا اور بس!

علامہ اقبالؔ کے کلام نے کتنے ہی صاحبانِ فکر ودانش کو اعلیٰ درجہ کی حکیمانہ صلاحیتوں کا خوگر بنادیا، ان کے کلام کی مقصدیت وعلویت نے ذوق وشوق کے کتنی ہی منزلوں کا سراغ دیا، یہ اقبالؔ شناسی فہمی صالح ذہنوں کو پاکیزہ نظر مطہر قلوب اور متجلی روح کے لیے اکسیر سے جدا نہیں ایک عالم اقبال کے کلام کا گرویدہ اس سے متاثر اور اس کا دیوانہ ہے لیکن موجودہ دور بلکہ ماضی قریب تک بھی فارسی دانی کا ربط وتعلق شوق وشغف کم کم ہی رہا ہے شاید اس لیے کلام اقبال کے تراجم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ عوام ہی نہیں خواص بھی مطالب ومفاہیم کو اردو میں سمجھنے کو پسند کرتے تھے۔ اقبال کا کلام وہ اردو ہو یا فارسی سراپا الہام ہوتا، جوش روانی اور برجستگی دوسری عام خصوصیت تھی اقبال کی شاعری میں انبساط وشگفتگی نہیں بلکہ وہ فکر انگیز مقصدیت رکھتی ہے۔ بقول صاحب اقبال کامل، اقبال نے اگرچہ اپنے ابتدائی عہد شاعری میں فارسی میں بھی طبع آزمائی کی تھی جس کا ۱۹۰۴ء کا ایک نمونہ ''نوادرِ اقبال'' میں محفوظ ہے لیکن ان کی فارسی شاعری حقیقۃً ''اسرار ورموز'' سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد تو مستقل طور سے وہ فارسی میں کہنے لگے اس درمیان ایسا نہیں ہوا کہ اردو کو انہوں نے بالکل ہی چھوڑ دیا بلکہ غالباً ۱۹۳۲،۳۱ء سے انہوں نے پھر اردو میں کہنا اور جمع کرنا شروع کردیا تھا (ص ۱۲۹)، چنانچہ شائقین اقبالؔ، اقبال کے فارسی کلام کے تراجم کی جانب متوجہ ہوئے۔ مجھے یہاں اقبال کے مترجمین اور ان کے تراجم کی بابت تفصیلات مہیا کرنا نہیں ہے مگر اس قابل قدر بزرگ مترجم سید احمد ایثار کے بارے میں کچھ باتیں اور ان کے تراجم پر گفتگو مقصود ہے۔

سلطنت خداداد یا میسور قدیم اور کرناٹک جدید کے صدر مقام بنگلور میں سید احمد ایثار

۲۵ر جولائی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ والدین کے اسماء سید جہانگیر اور والدہ کاندیہ بی (مرحومین) والد ملٹری میں میسور لانسرس میں کوارٹر ماسٹر تھے۔ ڈسپلن کے پابند مزاج سخت گیر تھا، لیکن غیور و رحم دل واقع ہوئے تھے۔ خاندان کے دوسرے افراد ملنسار، ہمدرد، علمی ادبی ذوق کے حامل تھے۔ خصوصاً ان کے ماموں، اسماعیل خان، ددھیال اور ننھیال میں اکثر حضرات فوج سے متعلق رہے۔ ایثار صاحب کی دادی، حضرت سید عبدالقدوس سر قاضی بنگلور کے خاندان سے تھیں ابتدائی تعلیم سوارلین (میسور لانسرنس اسکول) میں ہوئی۔ ہائی اسکول، سنٹرل ہائی اسکول میسور، انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن بی ایس سی کی تکمیل سنٹرل کالج سے کی، اور اس کے ساتھ ہی والد کے کہنے پر (I.S.C.R.C) میں ٹیوٹر کی نوکری کر لی۔ ۱۹۴۸ء میں والد کا انتقال ہو گیا والدہ کی ایما پر چہلم کے بعد محمد صدیق خان سپرنٹنڈنٹ محکمہ صنعت وتجارت کی صاحبزادی آصفہ بیگم سے پہلے منگنی اور ایکسال بعد ۱۹ر جون ۱۹۴۹ء کو شادی ہوئی وہ خواندہ اور سگھڑ خاتون ہیں، ایثار صاحب کی پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں دونوں تعلیم یافتہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ شادی کے بعد ایثار صاحب محکمہ جنگلات میں بحیثیت رینجر تقرر ہوا۔ ٹریننگ کے دوران ۱۹۵۰ء میں ذاتی خرچ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ کا قصد کیا وہاں واشنگٹن یونیورسٹی سے The Effect of Application to Articicial Fertilizer on height-radial branch gowth of 35 years old DaglasFIR" پر (M.F) کی ڈگری لی، اس ٹاپک کا آزاد ترجمہ یہ ہوسکتا ہے ''مصنوعی کھاد سے کسی پیڑ پودے کو کتنی جلد بالغ کیا جاسکتا ہے کہ وہ از خود نسل در نسل پیدا کرنے کے قابل ہو جائے۔'' امریکہ سے واپسی پر انہوں نے کئی تجربات کیے، آپ فارسٹ ڈپارٹمنٹ میں فاریسٹ کنزرویٹر کے علاوہ اسٹیٹ وایلڈ لائف کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ ان سب سرکاری امور کے ساتھ ساتھ کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا۔ ساتھ ہی شاعری کا ذوق ہمدم دیرینہ بنا رہا، جناب سید احمد آزاد سے مشورہ سخن کرتے ہے۔ بقول اسد اعجاز، اصلاح اس لیے نہیں کہتا کہ آزاد صاحب کسی شعر پر صلاح نہیں دیتے تھے۔ شعر کو اس انداز میں سمجھاتے کہ خود شاعر اپنے شعر کی خامیوں کو سمجھ کر خود ہی درست کر لے، ایثار صاحب غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی پہلی تخلیق غزل تھی جو ۱۸ برس کی عمر میں کہی تھی اور ۱۹۵۷ یا ۱۹۵۸ میں اخبار آفتاب اردو میں شائع ہوئی۔ اور پھر جب ۱۹۷۷ء میں عمر خیام کی ایک رباعی کا برجستہ ترجمہ کیا کیا کہ طبیعت محض ترجمہ

پر مائل ہوگئی عمر خیامؔ کی ایک رباعی اور اس کا ترجمہ دیکھئے۔

روزے کہ ''اذاالسماء انشقت''
داں دم کہ ''اذاالنجوم انکدرت''
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات
گویم ضما! ''بایِّ ذنب قُتِلت''

ترجمہ:

جس روز یہ آسمان شق ہوتا ہے
منہ تاروں کا جس وقت یہ فق ہوتا ہے
پوچھوں گا گریباں پکڑ کر اے صنم !
معصوم کا خون بھی کہیں حق ہوتا ہے

ترجمہ نویسی کے اس دلچسپی اور شغف سے عام شاعری سے دلچسپی کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''مڈل اسکول میں حضرت عبدالواسع عصریؔ بھی مضامین اچھا پڑھاتے تھے خاص طور پر شاعری، وہ خود بھی شاعر تھے۔ شعروں کی تشریح کرتے کرتے اپنی رو میں بہت دور نکل جاتے، انہوں نے ساری کلاس میں شاعری کا شوق پیدا کر دیا تھا..... ایک بار حضرت عصریؔ علامہ اقبال کی نظم ''صدیق اکبرؓ کا ایثار'' پڑھا رہے تھے میں اس نظم سے بہت متاثر ہوا، مجھے لفظ ''ایثار'' بہت پسند آیا اور اسے میں نے اپنا تخلص بنالیا، دراصل عصریؔ صاحب نے ہی میرے اندر اقبالؔ سے رغبت پیدا کی تھی،..... یاد آیا شموگہ میں بزم اردو کے زیر اہتمام یوم اقبالؔ منایا گیا تھا میں نے بھی ایک نظم 'بیادِ اقبالؔ'، لکھی تھی۔
(واردات ایثار ص ۸۴، وجہات اقبال)

غرض ایثار صاحب نے ۱۹۷۷ء میں باضابطہ شاعری شروع کی، خاص کر ترجمہ کی جانب ملتفت ہوئے یہ گویا باقاعدہ شاعری کا دوسرا دور تھا، کیونکہ درمیان میں شاید ۱۹۷۲ء میں شعر گوئی بالکلیہ ترک کردی تھی۔ اس کے بجائے قرآنیات میں اس قدر انہماک بڑھ گیا کہ تفہیم القرآن، تفسیر حقانی اور ترجمان القرآن کا مطالعہ، کیا تفسیر ماجدیؔ بھی دیکھی۔ اس دوران یہ خیال

دل و دماغ پر غالب و محیط رہا کہ ''کلام اقبال دور حاضر کی ضرورت ہے بلکہ فکر و فلسفہ اور خیالات کی آفاقیت کے لحاظ سے اقبال ہر دور میں دہرائے جانے والے ہمارے شاعروں میں سے ہیں۔'' اس طرح ایثار صاحب اقبال شاعر انفس و آفاق کے کلام خصوصاً فارسی شاعری کے ترجمہ پر مکمل توجہ دی جیسا کہ پچھلی سطور میں کہا جا چکا ہے کہ ترجمہ نگاری کے سلسلہ میں شروعات عمر خیام کی رباعی سے ہوئی۔ اہل ذوق جانتے ہیں کہ عمر خیام کی رباعیات کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ فٹز جبرالڈ نے کیا مگر خیام کی رباعیات سے لطف اندوزی کے لیے پھر فارسی سے رجوع ہونا پڑے گا۔ بہر حال افہام و تفہیم سے زیادہ ذوق شعری اور وہ بھی اپنے دوست سید حسین کی خواہش پر نے عمر خیام کی ۷۲ رباعیات کا ترجمہ کر دیا، بعض حضرات کا خیال ہے کہ عمر خیامؔ کی رباعیات کم ہیں اس میں الحاقی کلام زیادہ ہے اس کے مقابلے میں دیوان شمس تبریزؒ کی رباعیات وقیع ہیں۔ چنانچہ ایثار صاحب نے شمس تبریزؒ کی جملہ ۴۳۶ رباعیات کا ترجمہ کر دیا۔ اسی رو میں سعدیؔ شیرازی کی کوئی ۱۶۱ رباعیات کا بھی ترجمہ ہو گیا۔ بقول موصوف اس ''مشغلہ'' نے ان کی فارسی دانی اور شعر فہمی میں یک گوناں اضافہ کیا۔ پھر اسی سلسلہ میں انہوں نے حافظ شیرازی کے دیوان میں موجود (۸۸) رباعیات کے منجملہ ۳۳ رباعیات ہی کا ترجمہ کیا تھا کہ طبیعت کا اقتضاء کلام اقبالؔ کی جانب مائل ہوا، اپنے اس والہانہ جذبۂ ترجمہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ محض اتفاق اور توفیق خداوندی ہے کہ میں ترجمہ کے راستے پر چل پڑا، ۱۷ ستمبر ۱۹۷۷ء کو میں بھلا نہیں سکتا، نہ جانے وہ کونسی نیک ساعت تھی ایک نہایت دلچسپ واقعہ پیش آیا، آج بھی اسے یاد کر کے میں ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہوں..... میرا خیال پوری شدت کے ساتھ اپنے محبوب شاعر علامہ اقبال کے فارسی کلام کی طرف منتقل ہو گیا۔ آتش شوق پوری طرح بھڑکی ہوئی تھی خود اعتمادی نے دست دہی کی لہذا میں نے اپنے فاضل اوقات کو اسی کام کے لیے مختص کر دیا۔ ایک ایک کر کے ۱۹۸۲ء تک علامہ کی ساتوں فارسی تصانیف کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا، شوق تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا اسی رو میں بہتے ہوئے مولانا رومؔ کی مثنوی کی پانچ جلدیں ختم کیا، چھٹی جلد کے تقریباً ایک ہزار اشعار کا ترجمہ پورا ہوتا تھا کہ اس مقام پر پہنچ کر طوفان تھم گیا''۔..... میں نے اپنی شاعری کے مقابلے میں اقبال کی فارسی تصانیف کے ترجموں کی اشاعت کو ترجیح دی ہے

تا کہ فارسی زبان سے نابلد اردو داں طبقہ اس سے استفادہ کرے۔ اقبال کی فارسی تصانیف کے ایک ایک یا دو دو چیدہ چیدہ ترجمے چند اور حضرات نے بھی کیے ہیں لیکن ساتوں کتابوں کا ترجمہ شاید ہی کسی نے نہیں کیا ہے۔ (واردات ایثار ص ۱۰۰، وجہات اقبال)

اس طرح ایثار صاحب نے کوئی ستر ہزار فارسی اشعار کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے، ترجمہ کی بابت صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سلیس بامعنی بامحاورہ ہے جس میں فارسی شعر کا مفہوم بلکہ اس کی روح برقرار ہے ایک شعر کا ایک ہی شعر میں ترجمہ کیا گیا ہے، محاسن کے سلسلہ میں پروفیسر مسعود حسین خان کا یہ ایک ہی جملہ کافی ہے ''ترجمہ کا ترجمہ تخلیق کی تخلیق'' ویسے اس مسرت زا کیفیت کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال، باطنی اعتبار سے تخلیق کے تجربہ اور ترجمہ کے تجربہ میں کیا فرق ہے؟ پر موصوف نے کہا،

''دونوں میں سرور حاصل ہوتا ہے، تخلیق میں اس احساس سے مسرت ہوتی ہے کہ ایک اچھی چیز پیدا ہوگئی اور یہ ہماری اختراع ہے ترجمہ میں اس خیال سے کہ متن میں بیان کردہ مفہوم کو اپنے الفاظ میں ڈھالنے کی سکت پیدا ہونے پر خوشی حاصل ہوتی ہے دونوں میں مزا آتا ہے۔ اچھے ترجمہ پر دل خوش ہوتا ہے''۔ (ص ۱۹۶ انٹرویو ایثار صاحب)

ایثار کے منظوم تراجم اور کلام اقبال کی ترتیب بلحاظ سنین کچھ اس طرح ہے

اولین رباعی کے بعد مکمل رباعیات عمر خیام ۱۹۷۷ء بعنوان بادۂ خیام، رباعیات مولانا روم ۱۹۷۸ء بعنوان کشکول تبریز، رباعیات سعدی شیرازی ۱۹۷۸ء، جاوید نامہ ۱۹۷۹ء، اسرار خودی ۱۹۷۹ء ماہ مئی، ارمغان حجاز ۱۹۷۹ء ماہ جولائی، زبور عجم ۱۹۸۰ء ماہ اپریل، پس چہ باید کرد ۱۹۸۰ء، پیام مشرق ۱۹۸۲ء، رموز بے خودی اور مثنوی مولانا روم (۱۹۸۸ تا ۱۹۹۲ء پانچ جلدیں) لیکن پیام مشرق کی اشاعت سب سے پہلے عمل میں آئی اس کے بعد زبور عجم اور جاوید نامہ ۲۰۰۳ء اور شاید پس چہ باید کرد اور مثنوی مسافر، اسرار خودی اور رموز بے خودی غیر مطبوعہ ہیں، یہاں اس بات کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ علامہ اقبال کی جملہ سات فارسی تصنیفات اسرار خودی ۱۹۱۵ء، رموز بے خودی ۱۹۱۸ء پیام مشرق ۱۹۲۲ء، زبور عجم ۱۹۲۶ء، جاوید نامہ ۱۹۳۱ء، پس چہ باید کرد ۱۹۳۶ اور ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء ہیں ان کو مختلف اوقات میں صاحبان فکر و فن نے

تراجم اور کتابی صورت سے شائع کیا ہے۔

پیام مشرق: شبیر علی سیر خوشؔ ۱۹۲۳ء، عبدالرحمٰن طارقؔ ۱۹۵۲ء، فیض احمد فیض (منتخب منظومات) ۱۹۷۷ء، عصمت جاویدؔ (نثری ترجمہ) ۱۹۹۱ء، مضطر مجاز منظوم ترجمہ ۱۹۹۶ء،

اسرار خودی: جسٹس ایس اے رحمان ۱۹۵۲ء عبدالرشید فاضلؔ ۱۹۵۲ء، عصمت جاوید ۱۹۹۱ء،

جاوید نامہ: انعام اللہ خان ناصرؔ ۱۹۶۱ء، رفیق خاور ۱۹۷۲ء، مضطر مجازؔ ۱۹۸۱ء،

زبور عجم: جسٹس ایس اے رحمان ۱۹۷۷ء، عبدالرحمٰن طارق ۱۹۶۲ء

ارمغان حجاز: عبدالرحمٰن طارقؔ ۱۹۵۶ء، مضطر مجاز ۱۹۷۵ء، منور لکھنوی ۱۹۷۸ء

پس چہ باید کرد: ظفر احمد صدیقی ۱۹۵۰ء، مضطر مجاز ۱۹۷۵ء، رفیق خاور ۱۹۷۹ء

ان حضرات کے علاوہ جن لوگوں نے اقبال کے منتخب کلام کا منظور ترجمہ شائع کیا ان میں رووٗف خیرؔ کا پیام مشرق میں درج فارسی قطعات کا منظوم ترجمہ قنطار، بھی شامل ہے تاحال ایثار صاحب نے پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ کتابی شکل میں پیش کیا ہے جبکہ مثنوی پس چہ باید کرد، شائع ہو چکی ہے ماباقی تراجم اشاعت کے منتظر ہیں۔

واضح رہے کہ ادب میں خواہ نظم ہو کہ نثر ایک کیفیت، لذت و سرور ہوتا ہے۔ خصوصاً شاعری تو محسوسات کی دینا سنوارتی سجاتی ہے اب اس کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ اردو وہ بھی منظوم کس قدر دشوار ہوگا حیطۂ خیال میں لانا مشکل ہے۔ تاہم تشریح و تفہیم کی خاطر یہ کام انجام دیا جاسکتا ہے پھر بھی شاعر کا مافی الضمیر شعر کی روح تک پہنچنا ایک امر محال ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب مترجم جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس زبان میں کیا جارہا ہے دونوں پر کامل دسترس رکھے تاکہ واقعی معنی اور مطلب سے محظوظ ہوں۔ اس مرحلہ پر ایثار صاحب کے تراجم کلام اقبال کی بابت اتنا کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں شعری ذوق وشوق، تخلیقی قوت، اردو اور فارسی زبانوں سے اپنی گہری دلچسپی بلکہ جذباتی لگاؤ و نیز سادگی، روانی، شگفتگی و شستگی سے ان تراجم کو پیش کیا ہے، ویسے بھی اقبال کے افکار عالیہ اور فلسفیانہ نکات کا ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ان کا اسلوب، لب ولہجہ، شعری لوازمات، صوتی محاکات، تہذیبی اقدار و روایات ان سب کا اہتمام ترجمہ کی صورت سے کرنا آسان نہیں لیکن ایثارؔ صاحب نے بڑی جانفشانی اور بلند ہمتی سے یہ کارنامہ انجام دیا۔ ترجمہ کی دشوار گذار منزلوں کی جانب

نشاندہی کرتے ہیں:

''میں نے اپنے ہر ترجمے میں علامہ اقبال کی بحروں کو ہی استعمال کیا ہے اور تمام تراجم اصل متن کے ساتھ پیش کیا ہے، ترجمہ کے دوران ایسے کئی مرحلے آئے، آج سب یاد نہیں..... مثال کے طور پر پیام مشرق میں علامہ اقبال کا یہ مصرعہ

'' ہر مُلک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

مترجم کی ہمت توڑ کر رکھ دیتا ہے میں آپ کو وہ حصہ سناتا ہوں:

خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بردوگفت
ہر مُلک ملکِ ماست کہ مُلک خدائے ماست

ترجمہ:

تلوار لے کے ہاتھ میں ہنستے ہوئے کہا
اپنا خدا، خدائے جہاں، اپنی کل زمیں

بحر وہی ہو، وہی زور کلام اور اثر ہو میری دانست میں ایسا ترجمہ ناممکن ہے اسی کتاب میں ایک اور کٹھن مرحلہ آیا تھا، محاورہ مابین خدا اور انسان، کے زیر عنوان اشعار کے ترجمہ میں علامہ کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں۔'' (ص ۹۴)

عبارت مختصر! اقبال شناس، مرد بیابانی سید احمد ایثار کی بلند ہمتی، سعی وکاوش قابل تعریف وتحسین ہے کہ انہوں نے کلام اقبال کی خوبیوں، رعنائیوں کو کمال استعداد اور تخلیقی عمل سے ایک تازگی و شگفتگی پیدا کی ہے، ان تراجم کے سلسلہ میں انہوں نے لسانی قرب مشترک اور اوزان مشترک، استعارات و علائم نیز لفظیات سے خوب استفادہ اٹھایا اور نہایت حسن وسلیقہ سے یہ شعری کارنامے انجام دیئے اور حتی الوسع علامہ اقبال کے کلام کی مقصدیت کو آشکارا کیا ہے۔ بقول پروفیسر بی شیخ علی'' علامہ کا کلام ہمارے لیے آب حیات ہے، محبت کا پیام ہے، عمل کی دعوت ہے، تخلیق کی تلقین ہے، ترقی کا تازیانہ ہے، حسن بیان کا آئینہ ہے، خودی کا خزانہ ہے۔ عشق کا سرمایہ ہے۔ شاعری کا اعجاز ہے عشق رسولؐ کا گلدستہ ہے خالق کون ومکان سے قربت کا رہبر ہے''۔

اقبالؔ اپنی فکر وفلسفہ کے ذریعہ انسان خصوصاً مسلمان کو نائبِ حق کی صورت سے دیکھنے

کے آرزومند تھے ساتھ ہی وہ دنیا کے لیے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے بھی خواہاں تھے اس ضمن میں انہوں نے ملت اسلامیہ کو مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید پر متنبہ کیا اور قرآن حکیم کے روشنی میں زندگی گذارنے کا مشورہ دیا کیونکہ قرآن کا جاننا تقدیر حیات کا جاننا ہے وہ حق بھی ہے اور حق کی طرح بے مثال ولازوال بھی،

نور قرآں درمیان سینۂ ایں
جام جم شرمندہ از آئینہ ایں
اور مردِ حق کا کام بجز اس کے کچھ اور نہیں
حفظ قرآن عظیم آئین تست
حرف حق را فاش گفتن دین است

☆☆☆

طارق محمود (ملتان)
استاذ شعبہ اردو، پی جی کالج خانیول (پاکستان)

اقبال اور مجلّہ عثمانیہ

(جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا علمی وادبی مجلّہ)

دکن اپنے علمی وادبی پس منظر اور تہذیبی وثقافتی ورثہ کے باعث مسلمانانِ پاک وہند کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بہمنی دور (۱۳۴۷ء۔ ۱۵۲۶ء) سے عادل شاہی دور (۱۴۸۴ء ۔۱۶۸۷ء)، قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء۔ ۱۶۸۷ء) اور اس کے بعد مملکت آصفیہ کے ساتوں حکمرانوں نے اپنے دورِ حکومت (۱۷۶۴ء۔ ۱۹۴۸ء) میں اس خطہ کی علمی ادبی اور تہذیبی وثقافتی روایت کو موثر ومعتبر انداز میں بخوبی نبھایا۔ جس کا نتیجہ دکنیات کے باقاعدہ مطالعہ کے آغاز اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی صورت میں سامنے آیا۔ شعروسخن کی سرپرستی یہاں کے حاکمین کا شعار رہا ہے۔ جو خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اسی ادبی سرپرستی اور ادبی ذوق کے باعث دبستان دکن کے شعراء ونثر نگاروں کو تاریخ ادبیات اردو میں ہمیشہ بنظر استحسان دیکھا جاتا رہے گا۔

ریاست حیدرآباد دکن اقطاع عالم کے ہر شخص کے لیے ''یارِ مددگار'' کی صورت رکھتی تھی اس نے اپنے دست سخا سے کسی ملک، کسی ادارے اور کسی سوسائٹی (مسلم یا ہندو) کو کبھی مایوس نہیں کیا بلکہ مختلف اسلامی ممالک میں مساجد کی تعمیر اور فلاحی اداروں کی تمام تر ذمہ داریاں اس ریاست کے سپرد تھیں۔ اسی طرح دنیا بھر سے مختلف علوم وفنون کے ماہر اور دیگر امور زندگی کے کاملین نہ صرف یہاں رہائش پذیر ہوئے بلکہ اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے۔ جنہیں اس ریاست کی جانب سے تمام تر سہولیات کے باوجود مختصر اور طویل المدتی (لائف ٹائم) وظائف ملتے رہے (۱) یہاں کے حکمرانوں کے دلوں میں علمی وادبی ذوق رکھنے والی شخصیات کو حیدرآباد دکن لانے کا جذبہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ اپنی ذاتی خواہش پر یہاں آئے اور

کئی مشاہیر ایسے تھے جن کو بلانے میں حکمرانوں نے دلچسپی ظاہر کی۔ ان مشاہیر میں جلیل مانک پوری، جوش ملیح آبادی، داغ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی، الطاف حسین حالی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبال کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے، جنہیں نہ صرف شاہان وقت بلانے کی تمنا رکھتے تھے بلکہ وہ خود بھی اس خطہ کی علمی وتہذیبی تاریخ کے بہت بڑے مداح تھے اقبال اور حیدرآباد کا تعلق انتہائی گہرا تھا۔ اقبال کو یہاں مختلف امور کے حصول میں بھی دلچسپی رہی۔ اس علاقہ کی نمائندہ اور مشہور شخصیات مہاراجہ کشن پرشاد، اکبر حیدری، مسز اکبر حیدری، مولوی عبدالحق، مسز سروجنی نائیڈو، بہادر یار جنگ وغیرہ سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اسی تعلق کی بناء پر آپ پہلی بار مارچ ۱۹۱۰ء دوسری بار ۱۹۲۰ء اور تیسری بار ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور اپنے پہلے سفر کی یادگار کے طور پر ایک نظم گورستان شاہی (مشمولہ بانگ درا) کہی جسے سر اکبر حیدری اور ان کی بیگم کے نام نامی سے منسوب کیا۔ (۲) اقبال اور حیدرآباد کے تعلق کے حوالہ سے کئی اہم مطالعات شائع ہو رعلمی وادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں ان میں (i) نظم اقبال سفر حیدرآباد دکن اور سر اقبال کے تاثرات ۱۹۱۰ء میں مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ تاج احمدیہ پریس چار مینار حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء (ii) اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدآبادی مطبوعہ اقبال اکادمی، لاہور پاکستان ۱۹۴۱ء (iii) شاد اور اقبال مرتبہ، محی الدن قادری زور مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء (iv) ارمغان دکن مطبوعہ بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی ۱۹۷۷ (v) اقبال اور بزم اقبال حیدرآباد دکن از عبدالروف عروج، مطبوعہ دارالادب پاکستان کراچی ۱۹۷۸ء (vi) مفکر پاکستان اور حیدرآباد دکن از محمد حسام الدین خان غوری، مطبوعہ دارالادب، پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی، پاکستان ۱۹۸۱ (vii) اقبال اور حیدرآباد سید شکیل احمد، مطبوعہ الکتاب پبلشرز ڈسٹری بیوٹرس حیدرآباد دکن ۱۹۸۶ء (viii) علامہ اقبال اور اتحاد بین المسلمین از سلطان جہاں، مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۸۸ء وغیرہ شائع ہوئیں۔

حیدرآباد میں اقبال عوام وخواص دونوں میں یکساں مقبول، اور ہر طرف ان کی شاعرانہ فکر کے ثنا خواں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں پہلا ''یوم اقبال'' منانے کا اعزاز بھی (۹ جنوری ۱۹۳۸ء) اہل حیدرآباد کو حاصل ہے۔ (۳) اسی سلسلہ کا ایک اہم کام اقبال اکیڈیمی (۱۹۵۹ء) حیدرآباد دکن کا قیام ہے جس کے باعث اقبال کے بنیادی فلسفہ کی ترویج اور

عوام میں شعور بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی جو تا حال جاری ہے۔ اپنے قیام سے تقسیم ہند کے بعد تک اس اکیڈیمی کو مسائل کا سامنا رہا۔ تاہم حیدرآباد کے چند اقبال شناسوں ڈاکٹر عالم خوندمیری، پروفیسر صلاح الدین اور سید خلیل اللہ حسینی نے اپنی کوششوں سے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ہر سال اقبال اکیڈیمی کے تحت یوم وفات پر خصوصی سمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ مرکزی اقبال اکیڈیمی کے علاوہ اضلاع میں اقبال اکیڈیمی کی شاخیں کام کر رہی ہیں۔ (۴) اقبال اور حیدرآباد کے حوالہ سے بہت سے موضوعات ابھی تشنہ ہیں۔ جن کے حوالہ سے کسی اور مضمون میں بات ہوگی۔ کیونکہ اس مضمون میں ان دونوں کے تعلقات کا اعادہ مقصود نہیں بلکہ اقبال اور حیدرآباد کے تعلق کو جامعہ عثمانیہ کے علمی، ادبی و تحقیقی مجلّہ ''مجلّہ عثمانیہ'' کی قائم کردہ اقبال شناسی کی روایت کی ذیل میں دیکھنے کی خواہش ہے۔

مجلّہ عثمانیہ میں کئی مشاہیر خلیفہ عبدالحکیم، عبدالقادر سروری، سید محی الدین قادری زور، عزیز احمد، سکندر علی وجد وغیرہ نے اعلیٰ پائے کے مضامین اقبال کی زندگی، شاعرانہ صلاحیتوں اور مختلف نظریات کی اہمیت کے حوالے سے تحریر کئے۔ تاہم اس جائزہ سے پہلے جامعہ عثمانیہ اور مجلّہ عثمانیہ کا سرسری تعارف ضروری سمجھتا ہوں۔ جامعہ عثمانیہ (۱۹۱۸ء) مسلمانان برصغیر کے دیرینہ مطالبہ کے طور پر پہلی اردو جامعہ کی صورت میں معرض وجود میں آئی۔ اس جامعہ کا قیام آصف سابع میر عثمان علی خان کی قائدانہ صلاحیتوں اور فہم وفراست کا نتیجہ ہے۔ مسلم فکر، تہذیب وثقافت اور علم و ادب کا یہ مرکز مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا نقش اول بن کر ابھرا۔ یہاں تمام مضامین تاریخ، قانون فلسفہ، زراعت، تجارت، انجینئرنگ، میڈیکل اور دیگر علوم وفنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اردو کو کامیاب علمی زبان بنانے میں جامعہ عثمانیہ اور اس کے ذیلی ادارے دارالترجمہ (۱۹۱۷ء) کے بھرپور کردار سے سرمو انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ یوں جامعہ عثمانیہ اور اردو کے تعلق کو بھی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس جامعہ نے ہر شعبہ میں خاطر خواہ ترقی کی۔ آرٹس مضامین کے علاوہ سائنس کے میدان میں بھی یہاں کے طلباء نے نہ صرف ہندوستان بلکہ باہر کے ممالک میں بھی ریاست کا نام روشن کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں ہونے والی ان علمی، ادبی اور سائنسی ترقیوں کو مطالعہ عام و خاص تک پہنچانے کے لیے ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مجلّہ عثمانیہ کا اجراء عمل میں لایا گیا اس علمی و تحقیقی مجلّہ کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۷ء کو

منظر عام پر آیا۔ (۵) اس شمارہ کو (اولاً) دو حصوں یعنی اردو اور انگریزی میں تقسیم کیا گیا ☆ اس کے ابتدائی مدیر (اردو) سید محی الدین قادری زور اور سید معین الدین قریشی تھے جبکہ سید فضل حق انگریزی حصہ کے مدیر تھے۔ اساتذہ کی رہنمائی میں اس رسالے کے اجراء کی تمام تر ذمہ داری طلباء کے سر تھی۔ بہت کم عرصہ میں اس کا شمار اردو کے معدودے چند رسائل (نگار، دلگداز، مخزن، ہمایوں وغیرہ) کی فہرست میں ہونے لگا۔ (۶) اس رسالے نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنانے کے ساتھ ساتھ اس خطہ کی علمی روایت اور جامعہ عثمانیہ کے وقار کو بھی قائم رکھا۔ علامہ اقبال کی زندگی اور شاعری کے حوالہ سے کئی مضامین اس مجلّہ میں شائع ہوئے۔ ذیل میں ان مضامین کا جائزہ مختصر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ابتدائی مضمون، تبصرہ، پیامِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال از محمد حبیب اللہ رشدی (جلد۲، شمار۳، ۴ دسمبر ۱۹۲۸ مارچ ۱۹۲۹) میں شائع ہوا۔ جو اس موضوع پر ایک اہم کوشش ہے۔ اقبال کی حیات، شاعری اور خدمات کے حوالہ سے مجموعی طور تین مضامین (i) اقبال، حیات اور شاعری از عبدالقادر سروری (جلد۴ شمار اجون ۱۹۳۰) (ii) اقبال کی زندگی کے مختصر حالات از خلیفہ عبدالحکیم (جلد ۱۱ شمارہ ۳، ۴، ۱۹۳۸) اور (iii) اقبال کی خدمات از سید فخر الحسن (جلد۱۱ شمارہ ۳، ۴، ۱۹۳۸) شامل ہیں۔ تینوں ماہرین اقبالیات نے حیات اقبال، ابتدائی حالات، تعلیمی زندگی کے مختلف مدارج اور شاعری میں ان کے فنی و فکری ارتقاء کی تاریخ کو پیش کیا ہے، مجموعی طور پر اقبال شناسی کی روایت میں یہ مضامین اہم اضافہ ہیں۔ جن میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ غزل کی روایت میں بھی ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ اقبال کے مجموعہ ''بالِ جبریل'' کو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا نقطہ عروج شمار کیا جاتا ہے جہاں اقبال اپنی تمام تر فکر کو اپنے مخصوص انداز و کہنہ مشق مستند شاعر کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ اقبال پر اس مجلّہ میں سکندر علی وجد (جو خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر اور اقبال کے بہت بڑے مداح تھے) کے دو مضامین بالترتیب اقبال کی غزلیں (جلد ۸ شمارہ ۳، ۴، ۱۹۳۸) اور بال جبریل (جلد ۹ شمارہ ۱، ۲، ۱۹۳۶) شامل ہیں جن میں دونوں موضوعات کا احاطہ ایک ماہر نقاد کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اقبال کی غزل گوئی پر ان کا مضمون اہم ہے ساتھ ہی بال جبریل پر ان کا مقالہ اپنی تنقید اور نتائج کے حوالہ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے بال جبریل کی اشاعت کے ابتدائی دنوں میں ہی اسے آنے والے دور کا صحیفہ قرار دیا تھا۔ سکندر علی وجد اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

''بال جبریل بے شک بیسویں صدی کی بہترین تصنیفوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔اس کے ہر صفحہ پر زندگی کا ایک زبردست تلاطم نظر آتا ہے۔اشعار کیا ہیں طوفان حیات کی فلک بوس موجیں ہیں۔جن میں مردہ قوموں کا جمود خس و خاشاک کی طرح چشم زدن میں بہہ سکتا ہے۔جس شدومد کے ساتھ اس کتاب میں درس عمل پیش کیا گیا ہے،اس کی نظیر پیش کرنے سے کم از کم اردو ادب تو قاصر ہے۔یہ کتاب دراصل انقلابات وحوادث روزگار کے اسباب وعلل کا آئینہ ہے۔(۷)

محی الدین قادری زور نے اپنے دونوں مضامین ''اقبال کا اثر اردو شاعری پر'' (جلد ۱۱ شمارہ ۱،۲ مارچ ۱۹۳۸) اور شاد و اقبال کی مراسلت (جلد ۱۳ شمارہ ۴، ۱۹۳۸) میں بالترتیب اپنے پہلے مضمون میں اردو شاعری میں فنی وفکری تجربات اور مختلف تبدیلیوں کا باعث اقبال کو قرار دیا ہے۔کیونکہ اقبال نے خیال اور مصنوعی پن کو شاعری سے خارج کر دیا تھا اور حقیقت نگاری کی طرف توجہ دلائی تھی۔یقیناً ان اثرات کو آج بھی مختلف شعراء کے ہاں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مضمون میں حیدرآباد کی ہر دلعزیز شخصیت سرکشن پرشاد اور اقبال کے تعلقات کو مختلف خطوط (جو ان دونوں نے ایک دوسرے کو تحریر کئے) اور ڈائریوں کے ذریعے انتہائی استناد کے ساتھ پیش کیا ہے۔جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے آپسی تعلقات انتہائی شاندار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی اور صداقت ومحبت کا یہی جوش دونوں کے درمیان آخر تک باقی رہا اور ان کے خطوط اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔(۸) ایک اور مضمون، اقبال اور مسئلہ جبر وقدر (جلد ۱۴ شمارہ ۳، ۱۹۴۱) میں محمد داؤد خان نے اقبال کے بنیادی فلسفہ مسئلہ جبر وقدر کو نئے انداز سے پیش کیا ہے۔یہ مضمون اس موضوع کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔اقبال کے تصورات میں ابلیس کا کردار نہایت اہم اور متحرک ہونے کے باعث قابل احترام بھی ہے۔حمیدہ بیگم نے اپنے ایک مضمون ''ابلیس اقبال کی نظر میں'' (جلد ۲۱، شمار ۳، ۱۹۴۹) کو انتہائی جامعیت سے پیش کیا ہے اور انگریزی ادب میں بیان کئے گئے ابلیس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کے اس نظریے کو بھی بیان کرتی ہیں جس میں اقبال اس کردار کو فطرت انسانی کی ترقی کا ایک اہم جزو سمجھتے ہیں۔مختصراً یہ کہ ان کا یہ مضمون شاندار ہے۔بلبیر پرشاد بھٹناگر کے مضمون ''اقبال کا ذوق آگہی'' (جلد ۶۷ شمارہ ۱ مارچ ۱۹۳۴) میں انہوں نے

شاہان کی اردو دلچسپی اور سرپرستی کے ذکر سے شروع کرتے ہوئے اپنے مضمون کو موضوع کی مناسبت سے بہتر اور جامع بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اقبال کے حوالے سے مجلّہ عثمانیہ میں عزیز احمد کا ایک مضمون ''اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر'' (جلد ۱۱ شمارہ ۱، ۲، مارچ ۱۹۳۸) ایک کامیاب کوشش ہے۔ اقبال کی وفات پر مختلف علمی و ادبی رسائل نے تعزیتی پیغامات اور مضامین شائع کیے۔ مجلّہ عثمانیہ نے بھی اس غم کے موقع پر اپنا کردار بھرپور طریقے سے نبھایا۔ آہ! اقبال از محمد افضل الدین (جلد: ۱ شمارہ ۳، ۴، ۱۹۳۸) اور علامہ اقبال از خلیفہ عبدالحکیم (جلد ۱۱ شمارہ ۳، ۴، ۱۹۳۸) میں دونوں حضرات نے اقبال سے اپنی وابستگی، ان کے اردو پر احسانات اور جہانِ فانی سے کوچ کر جانے کو انتہائی شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس مجلّہ میں اقبال پر لکھے گئے سبھی مضامین اپنے موضوعات کی نوعیت کے حوالہ سے انتہائی اہم مطالعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی میں اقبال اور شخصیت اور فکر و فن کے حوالہ سے سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔ اقبال شناسی کی روایت تقسیم ہند سے پہلے اور خصوصاً تقسیم ہند کے بعد بہتر اور موثر انداز میں جاری ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانے میں برصغیر کے ہر خطہ سے اقبال کے ناقدین، مداحوں اور علمی و ادبی رسائل نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد نے بھی مختلف مضامین کی اشاعت سے خود کو اس روایت کا حصہ بنالیا۔ حیدرآباد اور اقبال کے خصوصی مطالعہ سے ہٹ کر بھی حیدرآباد میں موجود اقبال شناسوں نے اقبال کے نظریات اور افکار پر کئی کتابیں تحریر کیں۔ جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

جس طرح دیگر علمی و ادبی موضوعات پر شائع ہونے والے مقالات اس مجلّہ کے تاریخی کردار کے غماز ہیں اسی طرح اقبال شناسی کی جو روایت اس مجلّہ نے شروع کی وہ نہ صرف اقبالیات کے باب میں ایک نیا اضافہ ہے بلکہ یہ مضامین اقبال اور حیدرآباد دکن کے تعلق سے نیا تعارف بھی ہیں۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ مزید مطالعہ کے لیے ''حیدرآباد کی علمی ترقیاں'' مولفہ مولوی سید منظرعلی، حیدرآباد دکن احمد پریس ۱۳۵۵ھ

۲۔ علامہ اقبال اور سر اکبر حیدری مشمولہ اقبال اور عظیم شخصیات مرتبہ طاہر تونسوی لاہور، تخلق مرکز (س ن) ص ۱۵۲)

۳۔ اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدرآبادی، لاہور اقبال اکادمی، ۱۹۸۱، ص ۲۲

۴۔ حیدرآباد کے علمی وادبی ادارے از شفیعہ قادری مطبوعہ مکتبہ شعر وحکمت ریڈ ہلز حیدرآباد دکن ۱۹۸۳ء ص ۱۱۳

۵۔ مجلّہ عثمانیہ کی اردو خدمات، از عبدالقادر سروری مشمولہ مجلّہ عثمانیہ (جلد ۲۵ شمارہ ۱) ص ۶۴

☆ زوال حیدرآباد دکن (۱۹۴۸ء) کے بعد مجلّہ میں کنڑی اور تلنگی زبانوں کے حصوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ مختلف علاقائی زبانوں مرہٹی، تلنگی اور کڑی کے مضامین کثرت سے شائع ہونے لگے۔

۶۔ مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ادبی خدمات اور توضیحی اشاریہ مقالہ نگار طارق محمود مقالہ برائے ایم فل (اردو) شعبہ اردو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۲۰۰۳ء ص ۵۱

۷۔ بال جبریل از سکندر علی وجد مشمولہ مجلّہ عثمانیہ جلد نہم شمارہ ۱، ۲: ص ۳۰

۸۔ شاد و اقبال کی مراسلت از محی الدین قادری زور مشمولہ مجلّہ عثمانیہ جلد ۱۳ شمارہ ۴ ص ۹۹

☆☆☆

خبرنامہ

اقبال اکیڈیمی واسلامک ہرٹیج فاؤنڈیشن

اقبال اکیڈیمی کے اجتماعات

۱۔۴رنومبر ۲۰۰۷ء

توسیعی تقریر: جناب محمد ظہیرالدین، صدر اکیڈیمی

موضوع: گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات

کلام اقبال: جناب سید امتیاز الدین، معتمد اکیڈیمی

صدارت: جناب مضطر مجاز

۲۔۱۵ردسمبر ۲۰۰۷ء

توسیعی تقریر: جناب محمد ظہیرالدین، صدر اکیڈیمی

موضوع: اقبال کی شاعری میں شعائر حج سے متعلق تلمیحات کے رموز

صدارت: پروفیسر ایم ایم تقی خاں،

صدر نشین کمیٹی برائے فروغ مطالعہ سائینس (آئی ایچ ایف)

نظامت وکلام اقبال: جناب سید امتیاز الدین معتمد اکیڈیمی

۳۔۱۱رجنوری ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر: ڈاکٹر عبدالحق

سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

موضوع: اقبال ایشیائی بیداری کا شاعر

صدارت: جناب محمد ظہیرالدین، صدر اکیڈیمی

مہمانان خصوصی :۱) جناب محمد رحیم الدین انصاری، صدر نشین اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش

۲) ڈاکٹر سید عبدالباری، ریٹائرڈ صدر شعبہ اردو، اودھ یونیورسٹی و مدیر ماہنامہ ''پیش رفت''

۳) ملک زادہ منظور احمد

۴۔۱۸/فروری ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر: پروفیسر شمیم حنفی، سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

موضوع: جاوید نامہ، اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ

صدارت: جناب محمد ظہیر الدین صدر اکیڈیمی

کلام اقبال: سید امتیاز الدین۔ نظامت: جناب محمد ضیاء الدین نیئر

۵۔۸/مارچ ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر: ڈاکٹر معین الدین عقیل، پروفیسر کراچی یونیورسٹی،

حال وزیٹنگ پروفیسر اوکاسا یونیورسٹی (جاپان)

موضوع: فکر اسلامی کی تشکیل جدید،

دور حاضر کے عصری تقاضے اور علمائے ہندوستان کا نقطۂ نظر

صدارت: جناب محمد ظہیر الدین، صدر اکیڈیمی

کلام اقبال: جناب وجیہ الدین احمد

نظامت وکلام اقبال: جناب سید امتیاز الدین، معتمد اکیڈیمی

(نوٹ: صفحات کی کمی کی وجہ سے تقاریر کے اہم نکات شامل نہیں ہو سکے۔)

☆☆☆

اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کے اجتماعات

۱۔۱۱/نومبر ۲۰۰۷

توسیعی تقریر: پروفیسر سید راشد نسیم ندوی

(سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجس)

موضوع: اختلافِ امت کے آداب

(قرآن مجید اور سیرت طیبہؐ کی روشنی میں)

صدارت: جناب محمد ظہیر الدین صدر اکیڈیمی

تعارف: جناب محمد عمر علی خان صاحب کارگذار صدر فاؤنڈیشن

۲۔ ۲؍فروری ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر: پروفیسر اے آر ظفر

سابق صدر شعبہ نباتیات، عثمانیہ یونیورسٹی

موضوع: قرآن۔ ارتقائے حیات اور تخلیق انسان

صدارت: ڈاکٹر حسن الدین احمد، ریٹائرڈ آئی اے ایس

تعارفی تقریر: جناب محمد عمر علی خان، کارگذار صدر فاؤنڈیشن

کلام اقبال: جناب سید امتیاز الدین

نظامت: جناب قاسم رضا، معتمد فاؤنڈیشن

۳۔۵؍فروری ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر: ڈاکٹر خالد عبدالسمیع (حال مقیم شکاگو)

موضوع: اسلام کو غیر مسلموں کے سامنے کس طرح پیش کرنا چاہئے۔

صدارت: پروفیسر سید راشد نسیم ندوی

پروفیسر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجس

تعارف: جناب محمد عمر علی خاں، کارگذار صدر فاؤنڈیشن

نظامت: جناب قاسم رضا، شریک معتمد فاؤنڈیشن

خطاطی کے چارٹس اور قدیم کتب کا تحفظ

فاؤنڈیشن کی جانب سے خطاطی کے اہم چارٹس کے تحفظ کا کام جاری ہے۔ آئندہ ماہ سیرت طیبہ پر نمائش کا اہتمام پیش نظر ہے۔

.....

کتب خانہ

کتب خانہ میں الحمدللہ نئی کتابوں کا اضافہ ہورہا ہے۔ حسب ذیل معززین نے کتابیں مرحمت فرمائی ہیں۔ اکیڈیمی ان اصحاب کی ممنون ہے۔

۱۔ جناب میر عنایت علی (اورنگ آباد) ۳ کتابیں

۲۔ پروفیسر ساحل احمد (دہلی) ۵ کتابیں

۳۔ جناب اصغر ویلوری، معرفت جناب شاہ عالم۔ ۳ کتابیں

۴۔ جناب محمد مظفرالدین فاروقی (امریکہ)۔ ۲ کتابیں

۵۔ ڈاکٹر ریاض الدین ریاض (امریکہ) ۴ کتابیں۔ قابل ذکر

(i) The Triumphant Sun, by A Schimmel

(ii) The Safi path of Knowlige, by william C.Chittick

(iii) A Return to the spirit, by Martin Lings

۶۔ معرفت جناب محمد وجیہ الدین۔ ۱۲ کتابیں۔ ۲۰ رسائل

قابل ذکر: قرآن اور مستشرقین، اسمائے حسنیٰ (امام غزالیؒ)، ابن رشد، امام رازی، قدیم رسالہ العصر (مرتبہ پیارے لال شاکر میرٹھی) ۵ رسائل۔

۷۔ بتوسط جناب مصطفیٰ قاسمی، ۳ کتابیں۔

۸۔ پروفیسر محمد علی اثر۔ ۳ کتابیں

اس کے علاوہ جناب اقبال بیدار (بھوپال)، الحاج کبیر احمد، جناب قدیر زماں، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)، جناب سید امتیاز الدین، جناب مجتبیٰ حسین اور ڈاکٹر رحیم الدین کمال وغیرہ نے بھی کتابیں عنایت فرمائیں۔

جلد سازی (۸۰) کتابوں کی جلد بندی کروائی گئی۔

اقبال اکیڈیمی میں مہمانوں کی آمد

ماہ نومبر 2007 اور ماہ مارچ 2008 کے دوران حسب ذیل معزز مہمانوں نے اقبال اکیڈیمی اور اس کے کتب خانہ کا معائنہ فرمایا۔

ا۔ محمد عارف اقبال۔ مدیر اردو بک ریویو، نئی دہلی

تاثرات: کتابوں کا وقیع کلکشن حیدرآباد کے علمی اور ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ (۱۰ نومبر 2007

۲۔ پروفیسر سید عبدالباری۔ مدیر پیش رفت وریٹائرڈ صدر شعبہ اردو۔ اودھ یونیورسٹی (2009)

تاثرات: ''جی چاہتا ہے کہ دہلی چھوڑ کر اقبال اکیڈیمی میں معتکف ہو جاؤں۔ خدا ان مخلص خادمین کے حوصلہ کو بلند رکھے اور اس کے وسائل میں وسعت اور دائرہ کار میں پھیلاؤ کی سبیل پیدا کرے۔'' (11 رجنوری 2008)

۲۰۔ ڈاکٹر عبدالحق، سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

تاثرات: ''بہت دنوں سے خواہش تھی ایک بار اس ادارے میں حاضری دوں۔ اکیڈیمی کو جس خلوص اور ایثار سے سجا رکھا ہے، وہ قابلِ رشک ہے اور قابلِ ستائش۔ خدا آباد رکھے اس مکاں کو''۔ (11 جنوری 2008)

۴۔ جناب ملک زادہ منظور احمد

تاثرات: ''اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اقبالیات پر نادر کتابوں کا ایک گرانقدر سرمایہ رکھتی ہے۔ آج شام یہاں حاضری دے کر میں نے اپنے لئے شرف وافتخار کے کئی حوالے تلاش کئے ہیں۔'' (11 رجنوری 2008)

۵۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل پروفیسر یونیورسٹی وحال وزیٹنگ پروفیسر اوکاسا یونیورسٹی جاپان

تاثرات: کتب خانہ دیکھا، اس کی وسعت اور اس کے تنوع بھی دیکھا، خوش گوار حیرت سے دوچار ہوں۔ (8 رمارچ 2008)

مطبوعات

اقبالیات پر اکیڈیمی کی حسب ذیل اہم مطبوعات فروخت کے لئے دستیاب ہیں۔

ا۔ جاوید نامہ، منظوم ترجمہ از مضطر مجاز قیمت Rs: 150

۲۔ جاوید نامہ، اردو آزاد نظم میں ترجمہ از پروفیسر سید سراج الدین۔ قیمت Rs, 200

۳۔ اقبال، کشش اور گریز، از پروفیسر عالم خوندمیری، مرتبہ محمد ظہیر الدین قیمت Rs.55

۴۔ اقبال نئی تحقیق، از شکیل احمد (آندھرا پردیش کے محکمۂ آرکائیوز کے امثلہ میں موجود ریکارڈ پر مشتمل Rs.55

۵۔ انسان اور کائنات، (فکر اقبال اور سائنس کی روشنی میں) از پروفیسر یم یم تقی خان قیمت Rs 70

۷۔ Understanding Iqbal از پروفیسر سید سراج الدین، قیمت -/Rs.70

۸۔ آؤ اقبال سے ملیں۔ از صالحہ الطاف -/Rs.40

۹۔ اقبال کی نعتیہ شاعری۔ از پروفیسر غلام دستگیر رشید -/Rs.40

۱۰۔ پراچنا کوی (تلگو) از شاہ محی الدین -/Rs.30

۱۱۔ مقالات عالمی سمینار (۱۹۸۶ء)، مرتبہ ڈاکٹر کریم رضا -/Rs.50

☆☆☆

Vol: 17 Issue:1
April 2008

ISBN : 81-86370-36-6
Phone : 66663950

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

April 2008

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank,Hyderabad-28, A.P., INDIA